افسانے :-

آمنہ ابوالحسن

بائی فوکل

آمنہ ابوالحسن کے ۱۶ افسانوں کا دوسرا مجموعہ

یہ کتاب اردو اکادمی دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی
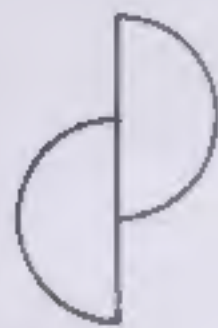
مصنفہ کی مطبوعہ کتابیں

۱. کہانی — افسانوں کا پہلا مجموعہ
۲. سیاہ سرخ سفید — ناول
۳. تم کون ہو — ناول
۴. واپسی — ناول
۵. آواز — ناول
۶. پلس مائی نس — ناول
۷. بائی فوکل — افسانوں کا دوسرا مجموعہ

(نوٹ) کہانی اور بائی فوکل کے علاوہ تمام کتابیں انعام یافتہ ہیں

متوقع کتابیں

۸. لوح محفوظ — ناول — زیر اشاعت
۹. کہانیوں کا تیسرا مجموعہ — زیر ترتیب
۱۰. آپ بیتی — زیر تصنیف

دوسرا افسانوی مجموعہ

آمنہ ابوالحسن

موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اشاعت : مارچ ۱۹۹۰ء
قیمت : چالیس روپے
کتابت : نظام قیصر راپخوی
سرورق : رزّاق ارشد
طباعت : اے ون آفسیٹ پرنٹرز نئی دہلی

تقسیم کار ———
موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولامارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

گردشِ دوراں کے نام.....

"اے غمِ زندگی اُداس نہ ہو
آ تجھے ہم گلے لگاتے ہیں"

——— آمنہ ابوالحسن

اندرونِ صفحات
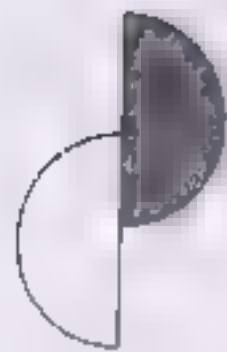
مقدمہ

کتاب ہٰذا کی مصنفہ آمنہ ابوالحسن کو ان کے ناول "پلس مائنس" پر جب ایوارڈ ملے تو مبارکباد دینا ضروری تھا۔ یہ فریضہ ٹیلی فون پر بھی ادا ہو سکتا تھا لیکن حرص الدنیا عذاب موت مبارکباد دینے کے بہانے میٹھے کھانے کے لالچ میں ان کے دولت خانے پر پہنچے۔ وہ اپنے افسانوں اور ناولوں کی طرح میٹھے اور دوسرے ڈش بھی بڑے لذیذ تصنیف فرماتی ہیں۔ ہم نے اس دن جو میٹھے کھانے کو ملے بہت ہی مزے دار تھے ساتھ ہی روز سے ان کے گلے پڑ گئے۔

مدعا یہ ہوا کہ میری اگلی کتاب کے افسانوں کے مسودے پڑھ کر مقدمہ لکھ دیں۔

جو شخص وقتاً فوقتاً [illegible] ہو کر [illegible] پڑھنا شروع کرتا اور صبح ہونے تک۔

رہا ہو وہ کیا خاک مقدمہ لکھے گا؟ ان داخلی امور پر روشنی ڈالے بغیر ہم نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ "مقدمہ بازی ہمارے بس کا روگ نہیں ہے۔ مقدمہ تو کسی مشہور آدمی سے لکھوایا جانا چاہیے جو مقدمہ لکھنے کے فن کی مہارت رکھتا ہو تو جواب ملا " تب لوگ کہیں گے کہ فلاں نے مقدمہ لکھا تھا اس لیے کتاب بک گئی۔ میں چاہتی ہوں کہ کتاب اپنے میرٹ (MERIT) پر بکے اور قبول خاطر ہو۔"

اس کا مطلب آپ جو چاہے نکال لیں۔ لیکن ہم یہی سمجھے کہ ہماری کم مائیگی تسلیم کر لی گئی ہے اگر مقدمہ معیار پر نہ اترا تو ہم سے گلہ شکوہ نہ ہوگا اور ہم سے ماہرانہ مقدمہ کی توقع نہیں رکھی گئی ہے۔ لہٰذا ہم نے روزے قبول کر لیے اور نیت باندھ کر مقدمہ لکھنے بیٹھے ہیں۔ دیکھیے اللہ کو کیا منظور ہے۔

پہلی بات تو یہ عرض کرنا ہے کہ افسانوں کے اس مجموعے کا نام "بائی فوکل" کی جگہ "عفریت" ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ "عفریت" فرقہ وارانہ اور دوسرے فسادات کی ہولناکیوں پر مبنی ایک کہانی ہے جو عصری مقتضیات کو پورا کرتی ہے اور مشعل راہ کا کام دیتی ہے۔ "بائی فوکل" حب الدنیا عذاب الموت کی گویا تفسیر ہے اور اس کی TOPICLALITY بھی مسلم ہے لیکن فرقہ پرستی کے "عفریت" کا مقابلہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

پچھلے دنوں پاکستان کے ایک ممتاز ادیب محمد فراز نے راقم الحروف سے یہ استفسار کیا تھا کہ فرقہ واریت اور فسادات کے خلاف جدوجہد میں اردو اور دیگر زبانوں کے ہندوستانی مصنفین کا کیا CONTRIBUTION ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس بات پر ان کے ملک میں زبان کٹتی ہے۔ وقت کی حکومت قلم چھین جاتی ہے پھر بھی وہ جابر سلطان کے آگے کلمۂ حق کہہ جاتے ہیں۔ یہاں (ہندوستان میں) ایسی کوئی پابندیاں نہیں ہیں پھر کیا بات ہے کہ یہاں کا مصنف اور فن کار فرقہ واریت اور فسادات کے خلاف قلم نہیں اٹھاتا۔

راقم الحروف کے پاس اس کا کوئی جواب اس وقت نہیں تھا لیکن "عفریت" کے مطالعے کے بعد یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ ہندوستان کا ادیب، شاعر اور فنکار بھی اس موضوع سے غافل نہیں ہے۔

"عفریت" کی خصوصیت یہ ہے کہ فسادات کی انسانیت سوزی کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ مصنفہ نے موضوع کے ساتھ نہ صرف انصاف کیا ہے بلکہ ایک ایسی مبنی برحقیقت عکاسی کی ہے کہ سماج کے سارے مذہبی، اخلاقی اور ثقافتی دعوے کھوکھلے نظر آتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر جسے ہم عقل و دانش کے دعویدار انسانوں کا معاشرہ کہتے ہیں وہ دراصل پاگل خانہ ہے اور جن کو ہم پاگل سمجھتے ہیں وہ ایسے سچے انسان ہیں جن میں خلوص ہے انسانیت ہے۔ ایک دوسرے کا دکھ درد سمجھنے کی صلاحیت ہے۔ یعنی وہ سارے اوصاف ان میں موجود ہیں جو ہوش و حواس رکھنے والے انسانوں میں ہونے چاہئیں۔

میں نے "تصویر" اور "عکاسی" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ افسانہ "عفریت" سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "جب حواسوں میں آیا تو اطراف مچی ہوئی چیخ و پکار، بھگدڑ، دہشت و وحشت، نالہ و شیون کچھ بھی نہ تھا۔ گہرا موت جیسا سکوت ہر طرف مسلط تھا۔ خون میں لت پت پھٹے ہوئے جسم، کٹے ہوئے اعضاء، بچے ہوئے گوشت کے لوتھڑے میرے اطراف پھیلے ہوئے تھے۔ جلے ہوئے گوشت کی سڑاند اور جمے ہوئے خون کی بساند میرے نتھنوں سے میرے دل و دماغ تک پہنچی تو پھر اپنی بمشکل تمام جمع کی ہوئی طاقت کو ہار کر تیورایا اور دوبارہ زمین پر گر پڑا۔"

ایک دردناک منظر کی لفظی تصویر کشی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس میں قدرتِ کلام کا بھرپور مظاہرہ ہوتا ہے، فن کار کا فن سر چڑھ کر بولتا ہے۔

اس کتاب کی مشمولات مختلف موضوعات سے متعلق ہیں۔ غیر مطبوعہ کے ساتھ چند مطبوعہ کہانیاں بھی ہیں جو اکثر خواتین کی نفسیات سے تعلق رکھتی ہیں۔

عورت کو ایک ENIGMA کہا گیا ہے۔ اس کے دل و دماغ کی اتھاہ گہرائیوں میں کیا ہوتا ہے وہ اس کو ایک بہت بڑا راز سمجھ کر اپنے سینے میں دفن کیے رکھتی ہے اور مرتے وقت اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ ان اتھاہ گہرائیوں تک پہنچنا بہت ہی مشکل کام ہے جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، لوگ اپنی لاعلمی کی وجہ سے اٹکلیں لگاتے ہیں اور انہیں ایک تواتر کے ساتھ دہراتے رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ خود اپنی ہی اٹکلوں پر ایمان لے آتے ہیں اور جب یہ اٹکلیں دوسروں کے سامنے آتی ہیں تو وہ بھی انھیں سچ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہی ہوتی ہے اور اس کا اظہار خواتین مصنفین کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کتاب کے افسانوں میں خواتین کے خیالات، جذبات و احساسات کا ایک AUTHENTIC نقشہ ملتا ہے۔

مصنفہ اپنے اطراف و جوانب کے واقعات پر گہری نظر رکھتی ہیں اور اس کا اظہار ان کے مختلف افسانوں سے جو اس کتاب میں شامل ہیں اور جو اس میں شامل نہیں ہیں ہوتا ہے۔ صحیح رہنمائی نہ ہونے کی وجہ اکثر بچوں میں عجیب و غریب NOTIONS پیدا ہو جاتے ہیں وہ گو ابتدا میں بے ضرر ہوتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ ان کی عمروں میں اضافہ اور ذہنوں کی پختگی کے ساتھ ان کی جڑیں قائم کر لیتے ہیں اور گھر کے بزرگ اس جانب توجہ نہیں کرتے۔ بعض مرتبہ ان کے توہم پرستی اور فرسودہ روایات پورے خلوص کے ساتھ بچوں کے دماغوں میں غلط خیالات ڈال دیتے ہیں جو آئندہ چل کر مستقل بن جاتے ہیں۔ اسی طرح کی ایک غلطی کی جانب افسانہ "پردہ" میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ملازموں کو ہدایت دی جاتی ہے کہ "بند وقت گھر کھانا کھانے سے

مسلمانوں کا مذہب "میلا" ہو جاتا ہے۔ اس میں بے چاری ملازمہ کی بھی غلطی نہیں اور نہ اس نے بدنیتی سے بچوں کو ڈرایا ہے بلکہ یہ اس کی کم علمی ہے۔ اس افسانے میں ملک و معاشرے کی بھلائی کو دل سے عزیز رکھنے والوں کے لیے ایک بہت بڑا سبق موجود ہے۔ طوالت کا خطرہ لاحق ہے اس لیے دوسرے افسانوں کے متعلق کچھ لکھنے کی گنجائش کم ہے لیکن ہاتھ کنگن کو آرسی کیا افسانے سبھی آپ کے سامنے ہیں اور اس کتاب کے ہر افسانے میں کچھ نہ کچھ مقصدیت موجود ہے اس لیے مصنف اپنی تمام کاوشوں پر یقیناً مبارکباد کی مستحق ہیں۔

سید ضیاء اللہ

دریچہ کھلتے ہی وہ ہوا اور روشنی کے سامنے تھی ہوا نے اس کے وجود کو اشتیاق سے چوما اور اسے جگمگا دیا۔ اس نے انگلیوں سے اپنے مچل جانے والے بال سنوارے اور روشنی کو ایک گھونٹ کی طرح پی کر ایک لمبی مطمئن سانس لی۔ اسے لگا کہ اندر کے سارے اندھیرے جانے کہاں غائب ہو گئے۔ تقویت کے اس احساس سے پٹے رہنے کو اس نے ایک کرسی کھینچ کر دریچے کے آگے رکھی اور اس پر ٹک گئی۔ کھلے دریچے سے اس نے دیکھا دور دور تک ہرے بھرے کھیت پھیلے ہوئے تھے اور دھان کی بالیاں یوں لہرا رہی تھیں جیسے ارد گرد کی ہر چیز کو اپنی آغوش میں سمیٹ لینا چاہتی ہوں۔ اس سے آگے کافی آگے کپاس کے جھنڈ تھے جن کے بند شگوفے ابھی کھلے نہ تھے، مگر پودوں کے سروں پر جا بجا قمقموں کی طرح ٹنگے ہوئے تھے۔

اگر یہ سلگ کر روشنی دینے لگیں تو۔ ؟ نشا نے سوچا اور اسے اپنے اس خیال پر خود ہی ہنسی آ گئی۔ وہ اکثر ایسی ہی بے مطلب باتیں کیوں سوچا کرتی ہے حالانکہ مطلب کی بات تو یہ ہے کہ.....

دفعتاً اس کا خیال بھٹک گیا کیونکہ ایک ننھا سا بچہ اپنی صحت مند مگر لڑکھڑاتی ٹانگوں پر سنبھلتا گرتا اٹھتا اٹھ کر چلتا کھیت کے بازو والی پگڈنڈی طے کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بچہ بالکل ننگ دھڑنگ تھا اور اس کی موٹی سی کمر میں ایک کالی ڈور بندھی ہوئی تھی جس کے ساتھ ایک سرے پر دو تین گھنگھروؤں کی آواز اگرچہ بہت مدھم سی نشا کے کانوں میں

پہنچ رہا تھا مگر اس جھنکار کے ساتھ ہی اسے چرچ کے گھنٹوں کا خیال آگیا۔ وہ گھنٹے جو عبادت سے قبل یا ختم پر بجا کرتے ہیں۔ دور چرچ کا خیال آتے ہی صلیب پر ٹنگے یسوع مسیح اس کے سامنے آگئے۔ اس کا سر عقیدت سے آپ ہی آپ جھک گیا۔ دوبارہ اس نے جب نگاہ اٹھائی تو سنبھل سنبھل کر چلتا گرتا اٹھتا ہوا بچہ پگڈنڈی کے سرے پر جا کر غائب ہو گیا۔ تب لمحہ بھر کے لیے ساری پگڈنڈی پر ایک خلا سا پیدا ہو گیا اور اس خلا کے احساس سے نشا پژمردہ ہونے لگی تبھی یکایک اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

ایک لڑکی جو سترہ یا اٹھارہ برس کی ہو گی بے حد رنگین لباس پہنے، سر پر دودھ کی گاگر اٹھائے پیروں کی پائلیں بجاتے اسی پگڈنڈی پر نمودار ہوئی اور اس کے چہرے کا مجموعی تاثر دیکھ کر نشا یہ فیصلہ ہی نہ کر سکی کہ اسے چاند کہے یا سورج۔ اس کا تمام وجود امڈی ہوئی گھٹا کی طرح بھرپور تھا اور ہونٹوں پر ایسی حسین مسکراہٹ جیسے آسمان کے افقی گوشوں پر سورج کی سنہری ضیا دمکتی ہو۔ آنکھوں میں پُرسکون جھیلوں کی سی کیفیت چال میں غزالوں جیسا مستانہ پن اور بڑھتے ہوئے قدموں میں بے فکری اور الہڑپن، زمانوں کے کرب سے ناآشنا، مسائل کی گرہوں سے بے خبر۔

نشا ایکدم اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور آگے کی طرف جھک کر بغور لڑکی کو دیکھنے لگی، اس کا دل چاہا آواز دے کر لڑکی کو پاس بلائے اور اس سے ضرور چند باتیں کرے مگر کون سی باتیں، اوّل تو اسے لڑکی کا نام نہیں معلوم۔ دوم اسے پاس بلا کر کیا پوچھے گی۔

وہ یہی سوچتی رہ گئی اور لڑکی تیز تیز قدم اٹھاتی پگڈنڈی طے کر گئی۔ نشا کی یہ خواہش کہ اس کی آواز نے اپنی جگہ دم بخود رہ گئی صرف نشا کے کانوں میں اس کے پائلوں کی کھنک برسات کی بوندوں کی طرح ٹپکتی رہ گئی اور پگڈنڈی پھر سونی ہو گئی۔

نشا اپنی کرسی پہ ٹک کر سوچنے لگی۔ یہ سب قدم کس طرف رواں ہیں۔

ننھے ننھے قدم۔

بے فکر الہڑ قدم۔

کیا پگڈنڈی کے سرے پر کوئی سنہرا کلس اطمینان و عقیدت کی مہین دھوپ میں

جگمگا رہا ہے یا کوئی سورج جو نکل چکا ہے یا کوئی چاند جو جاگنے والا ہے۔ آخر راستے پر اتنی تابناکی کیوں ہے، کس کا عکس ہے۔

اسے آرزو ہوئی وہ بھی اپنے کاٹج کا چوبی دروازہ کھول کر باہر نکلے اور اس پگڈنڈی پر چل کر دیکھے۔

پگڈنڈی کہاں سے شروع ہوتی ہے کہاں جاکر ختم ہوتی ہے۔

پگڈنڈی کی ابتدا کیسی ہے، انتہا کیسی۔ مگر وہ کرسی پر بیٹھی ہی رہ گئی کیونکہ ایکایک اسے گھنے بالوں کا ایک جھنڈ سا نظر آیا جو ایک ایسے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھا جس کے خدوخال بے حد مضبوط اور مثبت مثبت سے تھے جس کے ہونٹوں میں بانس کی بھوری بانسری پھنسی ہوئی تھی جس سے سُر یوں نکل رہے تھے جیسے آبشار سے نکلتی پھواریں۔ کالی کالی بکریوں کا ایک ریوڑ جس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ بکریاں دھان کے تازہ پودوں پر منہ مارنے کو بیقرار ہو رہی تھیں مگر ان کا نگران بانسری کے سروں کے ساتھ ساتھ انھیں بھی یوں بس میں کیے ہوئے تھا جیسے کہتا ہو :

نا بابا۔ انسانوں کی غذا تم نہیں کھاؤ گے۔ اسے کھا کر اگر تم بھی انسان بن گئیں تو۔ ؟ چلو۔ آگے بڑھو آگے۔ نشا پھر اپنی کرسی پر بے ساختہ آگے جھک گئی۔ صبح جب اس نے دریچہ کھولا تھا تو ساری پیش آنے والی باتیں اور مناظر بالکل اس کے ذہن و خیال میں نہ تھے۔ وہ تو کاٹج کی امس سے گھبرا کر دریچے سے آگے آئی تھی۔ مگر اس دریچے نے اس کے وژن کو للکارا تھا اور اب وہ یوں بے بس ہو کر اس دریچے کے آگے اٹک گئی تھی جیسے یہاں سے اٹھنا بھی چاہے تو نہ اٹھ سکتی ہو۔

قریبی تپائی پر رکھے رکھے اس کی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی اور جب ملازمہ نے اسے ناشتے کی تیاری کی اطلاع دی تھی تو اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر خاموشی سے لوٹ گئی تھی۔ نشا کو یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ ناشتے کا وقت کب کا گذر چکا ہے۔ اس کی ممی اس کا انتظار کر کر کے جانے کس مصروفیت میں گم ہو چکی ہیں اور اون میں پھنسی ہوئی سلائیاں دوسری کرسی کے کشن پر پڑی اس کی توجہ کی منتظر ہیں کہ جاڑے سے قبل ممی کا پوری بانہوں کا سویٹر

پورا ہونا ضروری ہے ورنہ ممی ہمیشہ کی طرح نشا سے کہیں گی:

تم ہر کام کرتی ضرور ہو مگر وقت پر نہیں۔

یہ سن کر اس میں کیفیتِ یاس ایک لہر کی طرح امڈے گی اور جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گی کیونکہ یہ سب پرانا ہے۔ بہت پرانا۔ اس کی اپنی عادتوں کی طرح اور ممی کی اسے سدھارنے کی تنبیہہ بھری کوششوں کی طرح۔ اس میں کہیں بھی کوئی چارم نہیں۔ نہ کسی امید کی آگ نہ کسی تمنا کے پھول نہ خواہشات کی تمازت......

وہ اکیلی پیدا ہوئی۔ اکیلی پلی۔ اکیلی ہی قدم قدم زندگی طے کرتی رہی۔ اس اکیلے پن نے اسے کوئی جوش دیا نہ جنوں۔ اکیلا پن کتنا پھیکا ہوتا ہے، کتنا بدمزہ۔ اگر اس کے بھی اور بھائی بہن ہوتے تو یقیناً زندگی میں بڑا خوشگوار ہنگامہ ہوتا۔ وہ اپنی اپنی خوشیوں اور خواہشوں کے لیے ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے، جیتتے ہارتے مگر نشا نے کسی سے معصوم جھگڑے کیے تھے نہ جیتنے ہارنے کی دوڑ میں حصہ لیا تھا۔ اس گھر کی ہر چیز صرف اس کی اپنی تھی۔ بلا شرکتِ غیرے اور اسی اطمینان نے نشا میں ایک ٹھہراؤ اور جمود پیدا کر دیا تھا چونکہ ہر چیز قابلِ حصول تھی لہٰذا وہ ہر چیز کو بڑی بے گانگی سے دیکھتی۔

جو بس میں ہو۔ جو اپنا ہو وہ کتنا معمولی۔ مزہ تو تب ہو کہ آدمی ڈھونڈ ڈھونڈ کر کھوج کھوج کر، چھانٹ چھانٹ کر اپنی پسند پائے تب بھی اس کا حاصل کرنا دشوار ہو۔

نشا نے اپنا سر جھٹکا اور سوچ کی راہوں سے ابھر کر بے اختیاری سے پھر باہر دیکھنے لگی۔ کہیں اپنی بے رنگی میں دریچے کے باہر کے انتہائی خوبصورت اور پرکشش رنگ نہ کھو جائیں۔

ریوڑ اب آدھی سے زیادہ پگڈنڈی طے کر چکا تھا اور مستحکم بدن والا چرواہا کھلے ہوئے دریچے سے جھانکتی ہوئی نشا کی پرشوق نظروں سے بالکل ہی بے خبر ہموار چال چلتا آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ نشا کے جی میں آیا دوڑ کر اس کے قریب پہنچے اور پاس سے بہت پاس سے اس کا چہرہ دیکھے۔ اس کے خدوخال جانچے۔ اس سے کہے چند منٹ کے لیے رک جاؤ۔ اور مجھے اپنی مضبوطی کا راز بتاتے جاؤ۔ مگر نشا پھر بھی کرسی سے اٹھ نہ سکی اور جب ریوڑ سمیت موٹی موٹی بھوری آنکھوں والا گڈریا اپنے لبوں میں بانسری دبائے

پگڈنڈی کے سرے پر غائب ہو گیا تو نشا کو یوں لگا جیسے ابھرتی جاگتی ہوئی نرم دھوپ اس کے وجود پر سے ہو کر نکل گئی ہے اور فضا میں دور کہیں وہ سُر ہلکورے لے رہے ہیں جن کی زبان دیہات کا پتہ پتہ بوٹا بوٹا سمجھتا ہے صرف وہی نہیں سمجھ سکتی مگر یہ سُر کہیں اس کے اندر بھی گونج گئے ہیں اور ان کی بازگشت رہ رہ کر اسے کسمسا رہی ہو۔

اس مرتبہ خالی ہو جانے والی پگڈنڈی کو دیکھنے سے قبل ہی نشا نے اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹیک دیا اور سوچنے لگی۔ وہ خلا دیکھ کر کیا کرے گی۔

وہ کوئی اسپوتنک تو نہیں جو جستجو اور کھوج کے مشن پر لگا ہو۔ جو زمین یا آسمان کے اسرار کی تلاش میں ہو وہ تو گوشت پوست کا ایک ایسا وجود ہے جس میں جان تو ضرور ہے مگر جانے کہاں گم ہے کہ خود کو بھی نظر نہیں آتی، خود کو بھی نہیں ملتی اور تب نشا نے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور بے ساختہ خود کو ڈھونڈنے لگی۔ ٹھیک اسی وقت کسی لاٹھی کی کھٹ کھٹ نے اسے پھر آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے کرسی کی پشت پر سر ٹکائے ٹکائے ہی نظر دوڑائی اور اس بار دیکھا کہ ایک ضعیف شخص جس کے ننگے بدن پر لباس کے نام کی صرف ایک لنگوٹی کسی ہے آہستہ آہستہ لکڑی ٹیکتا ہوا پگڈنڈی پر چلا آ رہا ہے اس کے سفید بال اس کے پتلے سوکھے ہوئے چہرے پر ٹوکرے کی طرح جمے ہوئے ہیں اور زندگانی کا رس اس کی رگوں سے بالکل ہی نچڑ چکا ہے نشا کو دفعتاً برقی جھٹکا سا لگا۔ معصوم بچہ، الہڑ دوشیزہ، کڑیل جوان کیا سب کی انتہا یہی ہے۔؟

اس خیال کے ساتھ ہی وہ بوکھلائی اور اس نے کھلا دریچہ بے اختیار بند کر دیا۔

نہیں، نہیں۔ اس آخری نظارے کے اختتام سے قبل ہی اسے خود میں کوئی نہ کوئی دریچہ ضرور کھول لینا چاہیے تاکہ بھرپور رنگین مناظر کی تمام دلکشی اور توانائی زندگی کا حصہ بن جائے ورنہ تمام سہانی رتیں اندھیرا بن کر پھر اس میں سما جائیں گی۔

کانچ کی اس کی طرح...... وہ اپنی جگہ جمی ہوئی وہ۔ دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ زندگی سے خراج حاصل کرنے کے لیے۔

ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

ثمینہ کام چھوڑ کر آئی اور بولی ــــ "یوں پاگلوں کی طرح کیوں ہنس رہے ہیں۔ کسی باؤلے کتّے نے تو نہیں کاٹ لیا آپ کو ــــ ؟"

"نہیں ... وہ اطمینان سے بولا "میں تو یوں حیران ہوں کہ میں نے کسی کو کیوں نہیں کاٹ کھایا اب تک !"

"کیا مطلب ہے ؟"

"تازہ اخبار میں خبر چھپی ہے کہ دو بیٹوں نے مار مار کر اپنے باپ کو ہلاک کر دیا ہے !"

"تو یہ ہنسنے کی بات ہے کوئی ــــ ؟"

" رونے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ خواہ مخواہ اپنی آنکھیں دکھانے سے حاصل ــــ ؟ ہو سکتا ہے کبھی آئندہ کسی ناپسندیدہ بات پر میرے بچّے بھی مجھے ...."

"چھی۔ خدانخواستہ۔ ہمارے بچّے ایسے نہیں چھوٹی موٹی ضدیں بے شک کر لیں۔ لیکن لیکن اس بے اطمینانی کی وجہ کیا ہے آخر۔ سکون کیوں نہیں کہیں بھی ؟"

"سکون" وہ پھر ہنسا " آج یہ لفظ بے مطلب ہو کر رہ گیا ہے ثمینہ ڈیر۔ تم یقیناً اس لفظ کے ڈکشنری والے معنی ہی لوگی لیکن آج کے حساب سے تو پچھلی تمام ڈکشنریاں بھی غلط ہو کر رہ گئی ہیں۔ اب تو لفظ کے مفہوم کے لیے نئی ڈکشنریاں بنانا ہوں گی۔ خیر چھوڑو یہ لو اخبار

ذرا باہر نظر تو ڈالو پھر تم بھی روتے روتے ہنسنے اور ہنستے ہنستے رونے نہ لگو تو کہنا ــــ"

"رہنے دو، رہنے دو، مجھے نہیں پڑھنا اخبار۔ ویسے بھی کام کم ہیں جو ایک کا اور اضافہ کرلوں، اور وہ بھی قتل خون خرابہ جاننے کے لیے۔ اونہہ!" وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں جاکر چھوڑا ہوا کام نپٹانے لگی لیکن اس کا ذہنی تناؤ کم نہ ہوا۔ کچھ بھی سوچتے ہوئے وہ گھبرا رہی تھی۔ اتنے میں بڑبڑایا ہوا ایاز کمرے میں آیا اور کوئی چیز الماری سے نکال کر اپنی جیب میں ٹھونس دی۔ ثمینہ نے پھولی ہوئی جیب کو دیکھا اور ایاز کو۔

"سنو!" وہ بولی

"سوری، میرے پاس وقت نہیں ممی ــــ"

"کیا ــ؟ ایک ذرا سی بات کے لیے تمھارے پاس وقت نہیں!"

"ہاں۔ مجھے بہت جلد جانا ہے!"

"کہاں۔ کونسی ٹرین نکلی جارہی ہے تمھاری ــــ؟"

"اُفوہ آپ کی جرح۔ اچھا کہیے کیا کہنا ہے آپ کو ــــ"

"اپنی جیب دیکھ رہے ہو ــ؟"

"نہیں ــــ"

"تو دیکھو ــــ"

"دیکھ ــــ"

"اسی طرح باہر جاؤ گے ــ؟"

"کیا حرج ہے ممّی ــ"

"تمھاری عمر کیا ہے ایاز ــــ"

"بائیس سال!"

"اور تمھاری حرکتیں ......"

"ممّی، ممّی۔ کیا یہی وہ ضروری بات ہے آپ کی؟!"

"ہاں میں تمھیں یاد دلانا چاہتی ہوں کہ اب تم اس عمر میں نہیں جہاں برتاؤ کی بابت

تمھیں سمجھایا جائے۔ آخر وہ کیا چیز ہے جس نے بدنمائی کی حد تک تمھاری جیب ابھار دی ہے۔"

ایاز نے اپنی جیب کو آہستہ سے تھپتھپایا۔

"میں جاؤں ممّی ــــ؟"

"شٹ اپ۔ بیٹھ جاؤ میں وہ چیز دیکھنا چاہتی ہوں۔" مگر ایاز اگلے ہی لمحے لمبی جست لگا کر دروازے سے باہر تھا۔ ثمینہ حیران ہکا بکا رہ گئی۔

یہ لڑکا کیا بننے جا رہا ہے آخر۔ کیا کرنے لگا ہے چھپ چھپا کر۔

وہ اپنا کام مکمل نہ کر سکی۔ ذہن پر ایک ضرب لگی تھی شنّو دوڑتی ہوئی آئی ــــ "ممّی ممّی سنا آپ نے ــ" گہری سوچ سے ابھر کر ثمینہ نے پوچھا ــــ

"کیا بات ہے شاہینہ؟"

"میگھا کہتی ہے یونیورسٹی اسٹرائک کے سلسلے میں آج طلبا اور پولس کا ٹکراؤ متوقع ہے کیونکہ طلبا نے وائس چانسلر کی کوٹھی کا گھیراؤ کر لیا ہے اور آتش گیر مادہ بھی ساتھ لے جا رہے ہیں۔ میگھا کا بھائی بھی ابھی ابھی ایاز کے ساتھ گیا ہے۔"

"کیا ــــ؟ تو اس لیے ایاز عجلت میں تھا؟" لمحہ بھر کو ثمینہ کا بدن کپکپایا۔ ایاز کی پھولی ہوئی جیب یاد آئی تو اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ لپک کر افتخار کے کمرے میں گئی ــــ "سنا آپ نے؟"

"اچھا تو اب تم بھی کوئی خبر لائی ہو۔ سناؤ۔"

"صاحبزادے وائس چانسلر کی کوٹھی کا گھیراؤ کرنے پولس سے ٹکرانے گئے ہیں۔ کچھ اور باقی ہے سننے کو۔"

"حالانکہ ہم نے اسے تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا تھا وہاں۔"

"چولہے میں گئی تعلیم۔ کسی طرح واپس لائیے اسے جا کر۔"

"فضول ہے۔ وہ نہیں آئے گا۔"

"کیوں نہیں آئے گا۔ کیسے نہیں آئے گا۔ ہم نے یہ سب کرنے کی اجازت نہیں دے رکھی ہے اسے۔"

"مگر ہماری اجازت کی ضرورت ہی کہاں ہے اسے۔"

"کیوں۔ کیا ہم اس کے ماں باپ نہیں ــــ؟"

"بے شک ہیں لیکن اگر اس کا راستہ روکیں گے تو وہ یقیناً ہمیں دھکیل کر آگے بڑھ جائے گا۔ آج کل کا یہی چلن ہے!"

"نہیں" ثمینہ نے بے یقینی سے کہا "ایسا کیسے ہو سکتا ہے"

"یقین کرو آج کل ایسا ہی ہو رہا ہے" افتخار مختصراً بولا۔ اسی وقت پردہ ہٹا اور نادرہ کھلکھلاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی "اوہ ممی ڈیڈی، یہاں ہیں آپ دونوں" ممی خاموش رہیں۔ ڈیڈی نے پوچھا "کیا کام آن پڑا ہے بیٹی"

"میں کلچرل ٹروپ کے ساتھ بمبئی جا رہی ہوں ڈیڈی۔ کل دن والی ٹرین سے"

"تو ہمیں کیا کرنا ہوگا ——"

"اوہ ڈیڈی کرنا تو کچھ نہیں آپ کو لیکن کیا یہ میرا فرض نہیں بنتا کہ آپ لوگوں کو اطلاع دے کر جاؤں!"

"شکریہ!" ثمینہ نے زہرخند سے کہا "لیکن ہم اجازت نہ دیں تو؟"

"کیوں نہیں دیں گی اجازت آپ؟ میں کوئی چوری ڈکیتی کرنے نہیں جا رہی ہوں۔ میں تو فن کی خدمت کرنا چاہتی ہوں"

"خدمت کی بچی، پہلے ماں باپ کی خدمت کرو" ثمینہ گرجی۔

نادرہ کی پیشانی پر بل نمودار ہوئے۔

"ممی ممی۔ بی ہیو یور سلف۔ آپ میری انسلٹ کر رہی ہیں"

"کیا۔ ؟ اب مجھے ادب سکھاؤ گی تم؟" ثمینہ کرسی سے اٹھ کر نادرہ کی طرف بڑھی مگر فتی دونوں کے درمیان آگیا —"کیا تماشا ہوگی اب —؟"

"نہیں میں اسے سامنے والے کمرے میں مقفل کرنا چاہتی ہوں" ثمینہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا

"بے کار ہے ——" افتخار آہستہ سے بولا۔

"پاپا صحیح سوچ رہے ہیں ممی" نادرہ نے بھی بھرائی ہوئی مگر بلند آواز میں کہا۔

"بکواس بند کرو تم ہمیں نہیں چھوڑ سکتیں، ہماری اجازت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتیں"

نادرہ نے پاؤں پٹخا "آپ بھول رہی ہیں میں بالغ ہوں اب" اور اپنی مرضی کی مالک ہے

افتخار اسے باہر دھکیل لے گیا۔

"شنّو ۔۔۔!" ثمینہ نے لرز کر پکارا

"جی ممّی ۔۔۔" شنّو لپک کر آئی۔

" سکندر اور اختر کہاں ہیں ۔۔۔ ؟"

" گراونڈ میں کرکٹ کھیل رہے ہیں ممّی "

تو ابھی جا کر بلا لاؤ دونوں کو ۔۔۔"

" اچھا ممّی ۔۔۔" شنّو دوڑتی ہوئی گئی اور لوٹ کر بولی ۔۔۔

" وہ نہیں آرہے ہیں ممّی ۔ وہ کہتے ہیں اس وقت ہم سکندر اور اختر نہیں ہیں، سنیل گاوسکر اور کپل دیو ہیں اور جب تک ہار جیت کا فیصلہ نہیں ہو جاتا یہ کچھ اور نہیں ہو سکتا "

" اُفوہ " ثمینہ نے اپنا سر تھام لیا ۔ ثمینہ کو اپنا دماغ چکراتا ہوا محسوس ہوا حالانکہ اس وقت افتی نہیں ہنسا تھا لیکن اس کی کچھ دیر قبل کی ہنسی ثمینہ کے کانوں میں گونج گئی رٹّا واہٹ سے بھری ہوئی ہنسی ۔ تو کیا وہ ہنسی نہیں تھی ۔ آنے والے زمانے کی چاپ تھی ؟ خوف بوند بوند اس کے خون میں گھلنے لگا ۔ تو کیا سب کچھ تہس نہس ہو گیا ۔ وہ اب تک ملبے پر اتراتی رہی ہے ؟ بارود بھری سرنگ پر کھڑی کسی بھی لمحے جل کر خاک ہو جانے کے لیے ۔۔۔ ؟ اور کا ایکی اتنے آنسو اس کی آنکھوں پر اُمڈ آئے کہ وہ انھیں خشک بھی نہ کر سکی ۔ ہر طرف پھیلی ہوئی بڑھتی ہوئی نفرت، نافرمانی، من مانی کو دیکھ کر بس یہی سوچتی رہ گئی کہ بھروسے ایثار اور محبت کے جو باغیچے اس کے پاس ماضی کی امانت ہیں انھیں کس طرح بچائے ۔ بڑھتی ہوئی سفاک ہولناک چاپ کیا ان پر سے بھی ہو کر گذر جائے گی ......؟

ایک بوند عطر کی

بے وقوف چاند۔ جہاں جہاں میں جاتی میرے پیچھے پیچھے چلا آتا۔ اونچی اونچی بلڈنگیں پھلانگ کر لمبے لمبے فاصلے الانگ کر۔ حالانکہ میں اس سے بچنا چاہتی کیونکہ چندا کا چہرہ مجھے اپنے شفیع کی طرح لگتا اور شفیع مجھ سے دور تھا۔

تو ایسے اداس لمحوں میں جب چاند میری کھڑکی کے مقابل آ رکتا تو میں دانستہ اپنی آنکھیں گھما لیتی لیکن اس کی مچلتی ہوئی کرنیں پھر بھی میرا دھیان اپنی طرف کھینچ لیتیں جیسا کہ شفیع کی بھی عادت تھی کہ چاہے میں کسی طرف متوجہ کیوں نہ ہوں وہ میری توجہ اپنی طرف پلٹائے بغیر نہیں رہتا تھا۔

چہرے پڑھنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ بچپن میں جب سب بچوں نے اسکول میں کتابیں پڑھی ہوں گی میں ہمیشہ چہرے پڑھتی رہی۔ انسانی چہرے مجھے ہمیشہ آئینوں کی طرح نظر آتے جن کے مقابل ٹھہر کر میں نے زندگی کا عکس ان میں صاف اور واضح دیکھا۔ [illegible] انسانی چہروں نے کرن کرن مجھ سے باتیں کیں لیکن شفیع کی بات جدا تھی۔

شفیع کو تیز رفتار اور موٹر چلانے کا جنون تھا۔ ان جنون نے مجھے اس کے قریب کیا کیونکہ میں بھی حادثات کی زد میں آنے سے بچنے، انہیں شکست دینے کے جنون میں مبتلا تھی چنانچہ ایک روز ٹریفک کی قوانین کی پروا کیے بغیر ایک دوسرے کو اوورٹیک کرنے کی ضد میں ہم ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ شفیع کے بائیں ہاتھ میں فریکچر ہوا اور میری پیشانی پر زخم آ

مجھے یقین ہے تم فوراً اسے پسند کرنے لگو گی۔ کیونکہ تمہیں حسن بہت پسند ہے نا!"

"سر پھر گیا ہے تمہارا۔" میں بیزاری سے بولی "حسن صرف شکل کا نام نہیں اور شکل تو ناسمجھوں کی کمزوری ہوتی ہے یا پھر آرٹسٹوں کی۔ نہ میں کم سمجھ ہوں نہ آرٹسٹ۔ لہذا اپنے دوست کو الٹے قدموں لے جاؤ کیا فائدہ بے چارے کی بے عزتی کروا کے۔"

وہ صورت لٹکائے لوٹ گیا اور پھر کچھ دن بعد بچوں کے حلقے میں آیا "خوب چیز ہیں نا؟" "ہاں بہت خوب، شریر اور پیارے، بالکل تمہاری طرح۔ تب!" "تب کیا ذہین لوگ ہی زندگی ہوا کرتے ہیں، بدھو تھوڑی۔" "تو ہا" "اُفوہ! تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ ان باتوں کا تو تمہیں خوب پتہ ہے جو تمہارے کانوں میں نہیں کہی گئیں لیکن جس بات سے، بخان اور ناواقف ہو وہ فقط یہی کہ کوئی تمہیں پسند کرتا ہے۔" "لیکچر ختم کرو چلو پانی میں اپنی کشتیاں ڈال دیں اور دیکھیں کہ کس کی ناؤ تھپیڑوں سے بچ کر کنارے کو جا پکڑتی ہے۔"

"اور جو کسی کی ناؤ ڈوب گئی تو؟" "تو اس کو صبر کرنا چاہئے۔ صبر اچھا جذبہ ہوتا ہے بہت ہی بڑھیا" میں طنز سے مسکرائی۔ شفیع نے گھور کر میری طرف دیکھا چند منٹوں تک دیا سلائی چبا چبا کر تھوکتا رہا پھر جوش سے بولا۔ "چلو دیکھیں۔"

انہی دنوں اس کا ٹرانسفر ہو گیا۔ وہ دوسرے شہر چلا گیا۔ میں ہنستی رہی۔ ہنستی رہی لیکن ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں اتنے سارے آنسو جمع ہو جاتے کہ میں انہیں بہا دینے کو بے قرار ہو جاتی مگر مجھے کوئی بہانہ نہ ملتا۔ میری ہر ضرورت نئی باقاعدگی سے پوری کر دی جاتی کہ مجھے ضد کرنے یا لڑنے کے لیے (کم از کم گھر میں) کوئی بات ہی نہ ملتی۔ اور یوں رونے دھونے کے تمام جواز خود بخود ختم ہو جاتے۔ حنا مجھے دیکھ کر کہتی۔ "آپ کو تو دوسروں کے چہرے پڑھنے کا شوق و جنون ہے نا مگر کبھی اپنا چہرہ بھی پڑھا ہے آپ نے۔؟"

لیکن اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے مجھے ہول ہوتی۔ میں کبھی آئینے کے مقابل نہ جاتی۔ اور تو میرے میری ہستی کے اندر لگا ہوا میری جان اور حساس سے متصل تھا اس نے بارہا مجھ سے کہا جھوٹی کب تک خود کو فریب دیتی رہے گی۔ زندگی بڑی مختصر ہے کھیل ختم کر۔ کیسا کھیل شروع کرنے کے بعد کسی نتیجے کے بغیر ایک ختم کردینا مناسب نہیں۔

دلیر اور باہمت محسوس ہوتا ہے۔

حنا اب میرے پاس بہت کم آتی اور جب بھی آتی مجھے صلواتیں اور جلی کٹی سنا کر جاتی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ خواہ مخواہ پھنس گئی جبکہ شفیع لمحہ بھر کے لیے بھی اس کا نہیں۔ میں نے حنا کو سمجھایا کہ شفیع اس کا ہے لیکن اسے میری باتیں جال کی طرح لگیں جو مچھیرے مچھلیاں پکڑنے سمندر میں پھیلاتے ہیں۔

میں اس کے بھولپن پر حیران رہ گئی اگر میں جال ہوتی تو شفیع اس میں پھنس ہی نہ جاتا؟ تو وہ بچا کس طرح لیتا؟ میں تو وہ خالی پنجرا تھی جس میں کوئی بھی پنچھی نہیں تھا میں نے اپنے دروازے کھول دیئے۔ قید تو قوتِ پرواز کو گھٹا دیتی ختم کر دیتی ہے۔ قید بڑی فضول چیز ہے لیکن حنا نے نہیں مانا۔

پھر ذہنی غیر ہم آہنگی کے باوجود شفیع کے گھر بچے ہوتے گئے۔ اس کی تدنی میں بھی معقول اضافہ ہوتا رہا۔ خوشحالی کی ساری خوشیاں اسے نصیب ہوئیں۔ اس کے قہقہے بھی نوکیلے ہونے کے باوجود داخل رہے مگر وقت نے آخر کار اسے نڈھال کرنا شروع کیا اس کے صندل جیسے جسم کی مہک کم ہو تی گئیں۔ اس کی ہستی کا تمام عطر رفتہ رفتہ کشید کروا کے زمانۂ دراز بعد وہ ایک روز اچانک میرے پاس آیا۔

"تو ان کشتیوں کی خبر لیں جو ہم نے وقت کے گرداب میں اپنی مضبوطی اور مہارت منوانے چھوڑ دی تھیں۔ اب جسم کا صندل ختم ہوا اور رتوں کے کھیت اپنی فصل دے چکے مگر تمہیں دیکھنا ہے کہ ہمارے وجود کی کسی کشتی میں عطر کی وہ ایک بوند باقی بھی ہے یا نہیں جو زمانے کا حصہ کسی طرح نہیں ہو سکتی"

میں نے گھور کر شفیع کو دیکھا...... "پاگل نہ بنو شفیع۔ وقت کڑی کا کھوٹ نہیں جس پہ جیب چاہو سوا ہو جاؤ۔ کوئی کوئی زندگی صرف عبادت ہوتی ہے۔ شب و دن کا چہرہ میلا مت کرو شفیع......" میں دوسری طرف دیکھنے لگی۔ وہ اٹھا اور چپ چاپ روانہ ہو گیا۔ میں نے اسے جاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا کہ اگر اتنے ہی سے میرے ضبط میری عبادت میں خلل پڑ گیا تو......؟

کاتبِ تقدیر

"کیوں توڑتے ہو کس محنت سے بنائے ہیں"

شکیل کو ننھے ننھے گھروندے توڑنے میں جتنا لطف حاصل ہوتا، نزہت کو اتنی ہی تکلیف ہوتی۔ شاہین ان دونوں سے بے نیاز کچی کیاریوں کو سنوارتا رہتا — "دیکھ بینا ساری دنیا کو گلزار بنا دوں گا ہر طرف پھول ہی پھول، اُگا دوں گا۔"

مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو پھیلتی تو اماں زور سے کھڑکی بند کر دیتیں۔ "کیسے اوٹ پٹانگ کھیل کھیلتے ہیں یہ بچے۔"

ابا اخبار کی سرخیوں پر نظر دوڑا کر پوچھتے۔

"چاولوں کے روپے کلو آرہے ہیں نزہت کی اماں۔ ؟ اور لیموؤں کا کیا کیا تم نے۔ ؟ اچار بنایا نہیں۔ ؟" ثروت چڑ جاتی۔ ابا کو ہمیشہ کھانے کی پڑی رہتی ہے۔ اماں سے ایسا سلوک کرتے ہیں جیسے وہ ان کی شریکِ حیات ہمدم و رفیق نہ ہوں بلکہ صرف کام کرنے کی مشین ہوں، اونہہ!۔

جب سے ماموں میاں مرے شکیل اور شاہین یہیں آگئے تھے کیونکہ ماں تو ان کی بچپن میں ہی گذر چکی تھیں اور ان کی خالہ بیچاری غصیلے خالو کے ڈر سے انھیں اپنے ساتھ لے جا نہیں پائی تھیں تب پھوپھی ہونے کے ناطے اماں انھیں لے آئی تھیں لیکن ابا — ارے توبہ! ابا اُن دونوں پر ہمیشہ کڑی نظر رکھتے۔

"ثروت اور نزہت تو کچھ کھاتی پیتی ہی نہیں پورا یقین ہے مجھے سب کچھ تمھارے یہی دونوں لاڈلے بھتیجے اڑا جاتے ہیں۔" یہ سن کر اماں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ "نگوڑیو کھاتی کیوں نہیں ہو؟"

اماں شکیل و رشاہین کو دسترخوان سے اٹھا دیتیں۔ "اب دیکھنا ثروت بیٹی یہ بڑے بھائی کے بچوں کو لگ سے کھلائیں گی۔ گھی کے مرتبان اور اچار مربے یونہی تو نہیں ختم ہو جاتے۔"

ثروت کی سمجھ میں نہ آتا کہ ابا کھلانے پلانے کے معاملے میں اتنے تنگ دل کیوں ہیں — جب خاصہ تو کما لیتے ہیں۔ کوئی بھیک نہیں لگی ہوئی۔ ایسے میں ماں کے پیچھے دو چار لقمے توڑ لیں تو بگڑتا ہی کیا ہے۔ مگر نہیں ابا تو جیسے ہمیشہ بیٹوں کا ہی کھایا کھوئے رہتے۔ پائی پائی کا حساب رکھتے اور بڑے طعنوں سے جب اماں خاموش آنسو بہاتیں تو شکیل چپکے سے ان کے پاس آ کھڑا ہوتا۔ "مت رویئے پھوپھی اماں" وہ ان کے آنسو پونچھتا۔ "آنسو تو موتی ہوتے ہیں۔" مگر اماں کو موتیوں کی قیمت کہاں معلوم تھی، ان کے حصے میں تو ہمیشہ آنسو ہی آئے تھے۔ گھر بار خرچ بچے سب کچھ ان کے ہو کر بھی ان کے نہ تھے۔ سب ابا کی عملداری میں آتے تھے۔ ابا کا حکم حرفِ آخر تھا گھر میں۔ ایسے میں زندگی کا کیا سکھ تھا۔ اٹھو بیٹھو ہر ہر طرح کا حکم بجا لاؤ بس یہی اماں کی زندگی تھی۔

"میں تو ہوائی جہاز میں اڑوں گا پھوپھی اماں، خوب اونچائی پر۔ بالکل آسمان کے سینے میں اور آپ کو ہمیشہ ساتھ رکھوں گا، اور کون کون چلے گا میرے ساتھ۔؟" "مجھے تو نہیں چلنا اگر وہاں صرف جنگل ہی جنگل ہوئے تو۔؟" نزہت بے دلی سے کہتی لیکن ثروت فوراً تیار ہو جاتی۔ "میں چلوں گی شکیل، ہم دونوں اونچائی سے پتھر پھینکیں گے، نزہت کے گھروندے اور شاہین کی پھلواری تباہ ہو جائے گی۔" اظہارِ مسرت کے طور پر تالیاں پیٹتی اور وحشیانہ قہقہے لگاتی۔

اماں کام سے سر اٹھا کر تنبیہ کرتیں۔ "چلو پڑھنے بیٹھو سب۔ تمہارے ابا کے آنے کا وقت ہو چکا ہے۔" اماں کی خوفزدہ نظریں دروازے کو تاکتی رہتیں۔ وہ ابا کے قدموں کی قریب — آتی آہٹ بچوں کے قہقہوں کی دشمن بن جاتی۔ پھر فضا تھوڑی دیر کے لیے بالکل ساکت ہو جاتی۔ ایسے میں ایک روز شکیل نے کہا۔ "اب میرا بیاہ جلد کر دیجیے پھوپھی ماں، میں اور ثروت، اکٹھے ہوائی جہاز اڑائیں گے اور دور دور تک کھلی فضا میں سیر کریں گے۔"

"چپ" اماں نے شکیل کا منہ مسل دیا۔ "بیاہ کیا یونہی ہو جاتا ہے لگلے۔ پہلے پڑھو لکھو، کمانے لائق بنو تب بیاہ کی بات سوچنا۔ لیکن شکیل کو پڑھائی سے مطلق کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پڑھائی اس کے لیے سب سے کٹھن مسئلہ تھا۔ ہوائی جہاز کی اڑان اس کی زندگی کا

وہ تو مقصد تھا پڑھائی تو وہ محض پھوپا صاحب کے ڈر سے کر رہا تھا ورنہ کھانا پینا بند اور قید تنہائی الگ۔ ابا کو اس کی پڑھائی کا اعتبار ہی نہ تھا۔ "خواہ مخواہ جھونک رہا ہوں پیسہ۔ واپس ملنے کا نہیں۔ جمع ہی کروں تو ثروت نزہت کا جہیز تیار ہو جائے۔" ابا کو بیٹیوں کے جہیز کی بڑی فکر تھی اماں چڑ جاتیں۔

"ابھی کونسی بڑی ہو گئی ہیں بچیاں جو ابھی سے جہیز کی فکر کر رہے ہو۔ خدا سب کی عزت رکھنے والا ہے۔" وہ ہمیشہ خدا کے حضور تو پیارے رہتیں "وہ ہماری بھی رکھے گا۔"

"وہ تو ہے لیکن پارس قسمت سے ملتا ہے، کسی اور نے چھو لیا تو پتھر بن جاتا ہے۔" دادی بار بار جتلاتیں۔ ابا پارس کی تلاش میں سرگرداں رہتے۔ اپنی اپنی قسمت؟ ورنہ شکیل ہمیشہ جتاتا

"کیا میں پارس نہیں ہوں پھوپی اماں؟"

"تو پارس ہی ہے میرے لال لیکن ـــ لیکن......" ماں چپ ہو جاتیں تو نزہت تالیاں بجا بجا کر چلاتی۔ "تم پتھر ہو پتھر ـــ"

شاہین نزہت کو ڈانٹتا۔ "پتھر نہیں پھولوں کی بات کرو۔ پھول نازک ہوتے ہیں اور پتھر زخمی کر دینے والے ـــ"

"فضول بکواس۔" ابا جھنجھلاتے "ان بڑوں کو سوائے احمقانہ باتوں کے اور کوئی کام نہیں میری معصوم لڑکیوں کا بھی نقصان کر رہے ہیں۔"

مارے خوف کے ابا نے فوراً ثروت کا رشتہ اپنے بھانجے توفیق سے طے کر ڈالا۔ شکیل ابھی پڑھ رہا تھا مگر توفیق اپنے باوا کے پیسے سے دھڑا دھڑ کوٹھیاں بنا رہا تھا، زمین خرید رہا تھا، جانے اسی طرح سے وہ کیا کیا کر رہا تھا۔ تعلیم کو توفیق نے پھٹے ہوئے کاغذ کی طرح بیکار مان کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا تھا۔

"سنو تو...... سنو تو......" ماں ہکلاتی رہ گئیں لیکن ابا نے ان کی ایک نہ سنی، قرعہ توفیق کے نام ہی پڑا۔ "کتنا لائق ہے میرا بھانجا۔" ابا ہمیشہ فخر سے کہتے۔ اس فیصلے کے بعد پڑھ لکھ کر ہوائی جہاز اڑانے اور اونچائیاں سر کرنے کی خواہش خاک ہو گئی۔ پٹر پٹر بولنے والی ثروت گنگ سی ہو گئی اور ثروت سے بچھڑنے کے خیال سے شکیل حد درجہ جنونی۔

"جی چاہتا ہے۔ سب کے پرخچے اڑا دوں" وہ بل کھاتا تو اماں آہستگی سے کہتیں۔ "تیرا نصیب تیرا مقدر میرے لال"

دادی پن کٹی میں پان کوٹ کوٹ کر اپنا پوپلا منہ چلاتیں۔ "مقدر کو کیا ہوا ہے۔ کمانے والے کی سلامتی مناؤ سب کو پیٹ بھر کھانا اور تن بھر کپڑا سبھی کو میسر ہے"

نزہت جل جاتی۔ "دادی وقت بے وقت کیوں بولا کرتی ہیں آخر۔ خاموش نہیں رہ سکتیں۔؟"

نزہت کو شکیل پر بڑا رحم آتا۔ ہائے شکیل اور آپا ثروت کی جوڑی کیسی اچھی تھی۔ جانے یہ توفیق بیچ میں کہاں سے آگیا، تو شکیل الٹا نزہت کے سر ہو جاتا۔

"کیوں گھورتی ہو مجھے اس طرح جیسے کھا جاؤ گی۔ "تمہاری آنکھیں بلیوں کی طرح ہیں بھوری اور بے وفا۔ تم کبھی دوست ثابت نہیں ہو سکتیں"

"ہش گھورے میری بلا دراصل جلتے ہو تم کہ تمہاری آنکھیں مجھ جیسی خوبصورت نہیں اور پھر ثروت آپا کے چھن جانے کا غصہ ناحق مجھ پر کیوں نکالتے ہو، میرا کیا قصور ہے اس میں"

"تجھ سے کون جلے گا بھلا، ہے ہی کیا تجھ میں"

"تو پھر توفیق بھائی سے جل رہے ہونا"

"اس پر تو ایک دن ہوائی جہاز گراؤں گا۔ ان کی تمام کوٹھیاں، زمین، باغات اجاڑ کر ہی دم لوں گا" پھر یکایک شکیل کی زبان رک جاتی، احساس سہم جاتا۔ خیال جان چھوڑ دیتے اس کی آنکھوں میں وحشت اتر آتی اور نزہت ڈر ڈر کر سوچتی۔ اچھی بھلی شکیل کی آنکھیں ایسی خونخوار کیسے ہو گئیں۔؟ وہ لپکی لپکی اماں کے پاس جاتی۔ "میں کبھی بیاہ نہیں کروں گی اماں خوب پڑھوں گی خوب پڑھوں گی"

"نوج، چپ ہو جا، پاگل ہوئی ہے کیا موئی" اماں اسے جھڑک دیتیں۔ "شادی بیاہ کی باتیں لڑکیاں نہیں کرتیں"

نزہت اپنے آنسو پونچھتی تو ابا اس کی ڈھارس بندھاتے "ضرور پڑھنا بیٹی ضرور پڑھنا" مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ یکایک ایک رات ابا کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ دادی مجھ لوں

کی طرح تخت سے چمٹی رہ گئیں، اماں خلاؤں میں معلق نظر آنے لگیں۔ شادی شدہ ثروت کے ہاں ہر سال بچہ ہر سال بچہ۔ پوری جمنٹ تیار ہونے لگی اور سنہری دھوپ کی طرح دمکتی ثروت تیزی سے اندھیرا بننے لگی۔ ایسے میں بے درد شکیل نے بڑھ کر سب کو سہارا دیا۔ اس نے ٹھکتی ہوئی دادی کو پھر کوشش سے ہمیشہ کی طرح تخت نشیں کروایا اور پھوپی ماں کو خلاؤں سے کھینچ کر دوبارہ زمین پر ان کے قدم جمائے تو پہلی بار شکیل کو زندگی کا صحیح مفہوم معلوم ہوا۔ زندگی خود کو ملے نہ ملے دوسروں کو ضرور مل جائے۔ اسی بڑائی کے سہارے وہ دھیرے دھیرے دنیا کے ساتھ چلنے لگا۔

اُدھر شاہین نے سوچا، کیوں نہ وہ نزہت سے بیاہ کر کے پھوپی اماں کا تمام بوجھ ہلکا کر دے مگر چڑ کا کھائی ہوئی ثروت آڑے آ گئی۔

" پہلے شکیل کا بیاہ ہونا چاہئے اماں، نہیں تو لوگ کہیں گے کہ اپنی بیٹی کو اپنانے کی خاطر شاہین کا بیاہ کر کے آپ نے شکیل سے ناانصافی کی "

اس بات کو اماں فوراً مان گئیں۔ ہر وقت دباؤ میں رہ رہ کر مدافعت اور مقابلے کی قوت ان میں باقی ہی نہیں رہی تھی۔ شاہین نے بہت سمجھایا۔

" بادل اس لیے برستے ہیں پھوپی اماں کہ زمین کی کوکھ میں بیج پڑے غنچے کھلیں، حیات نمو پائے مگر جب بادل برسے بغیر سوکھے سوکھے لوٹ جاتے ہیں تو ساری فضا پر کیسا ناقابل برداشت حبس طاری ہو جاتا ہے بس اُمس ہی اُمس، گھٹن ہی گھٹن کبھی غور کیا آپ نے ؟ " بس پڑھاتا جیتی ہوئی ماں کچھ بیٹھ میں سارا مصالحہ آنکھوں میں چڑھ بیٹھیں۔ بادل، بیج، زمین، غنچے۔ انھوں نے ان کے متعلق کبھی کچھ سوچا نہ تھا۔

" سب بکواس ہے " ثروت بالکل ماں کی طرح کہتی اور یہ کہتے وقت وہ بھول جاتی کہ ابّا کے جس غلط فیصلے کا وہ شکار ہوئی ہے کسی طرح خود اپنے غلط فیصلے کا شکار نزہت کو کیوں کرے۔ نزہت جو اس کی سگی بہن ہے کم از کم ثروت کو اس کی راہ میں پتھر نہیں بچھانے چاہئیں مگر اپنی ناکام نامرد خواہش کی خلش اسے اکسائے جاتی۔ اگر تو خوش نہیں تو سب کیوں خوش رہیں۔ جو تو نہ پا سکی وہ وہ کوئی اور کیوں پائے ...... " کیوں توڑتے ہو گھروندے کس محنت سے بنتے ہیں " نزہت نے دھیرے سے کہا مگر ثروت کا اٹل ارادہ اور پھوپی کا جھکا ہوا سر دیکھ کر شاہین یہ بھی نہ کہہ سکا

میں نے کتنے چاؤ سے ایک الگ پھلواری بنائی تھی لیکن کسی فاختہ کے جوڑے نے اس میں پناہ نہ لی ایک ابابیل اڑتی ہوئی آئی اور اس کی شاخوں سے لپٹ گئی۔ پھلواری سوکھ گئی ..... شاہین نے پہلی بار سب سے دوری اور دنیا سے نفرت محسوس کی۔ مزید کچھ کہے بغیر اس نے اپنا کوٹ کندھوں پر ڈالا اور اس کا ارادہ بھانپ کر نزہت بلبلائی "نہیں نہیں، بچپن سے اب تک کا ساتھ رائیگاں نہ جانا چاہیے کچھ کرو، کچھ تو کرو۔ آخری کوشش!"

"بیکار ہے، یہ سفاک دنیا کسی کی نہیں نزہت، نہ میری نہ تمھاری نہ ہی کسی پیار کرنے والے کی۔ مجھے مت روکو، جانے دو۔ دروازہ کھول کر شاہین باہر نکل گیا۔

"اسے روکو وہ جا رہا ہے اماں" نزہت تڑپی۔

"جانے دو، واپس آجائے گا خود" ثروت نے بے حسی سے کہا، اماں کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو انھوں نے شکیل کا سہارا لیا" اے روکو شکیل اسے روکو"

شکیل نے آسمان کو دیکھا، اے کاتبِ تقدیر.....؟

تب وہ بے تحاشا شاہین کے پیچھے دوڑا" رکو شاہین رکو مجھے دیکھو، میرے تحمّل پر غور کرو" مگر شاہین نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

گلی کے موڑ پر اس کا ڈولتا ہوا ہیولا ایک دم نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ قدموں سے چھوٹی ہوئی دھول جلتی سسکتی رہ گئی۔

بادلوں کے آنسو خشک ــــ زمین پر بچھ بچھ گئے مگر کوئی کلی نہیں کھلی، کوئی غنچہ نہیں مسکرایا فضا کے ماتھے پر چند قطرے البتہ چمکتے رہ گئے۔ یہ شاید نزہت کے آنسو تھے جو ثروت کی ناکامی کی آنکھوں سے نزہت کے قہقہوں کی آنکھوں میں آ گئے تھے۔

مولی

جیسے ہی بس آئی مولی نے بمشکل تمام بے قدم اٹھائے اور لڑکھڑاتی ہوئی آگے بڑھی۔ بچوں کی نگرانی کرنے والی آیا ارملا نے آگے بڑھ کر بس میں سوار ہونے میں مولی کی مدد کی اور سنبھال کر مولی کو سیٹ پر بٹھلا دیا۔ بس چل پڑی۔

مولی نے سرخ رنگ کا معمولی سوئٹر پہنا ہوا تھا۔ سوئٹر کے نیچے ملگجی فراک۔ اس کے سفید موزے اور سفید جوتے بھی کثرت استعمال سے میلے ہو چکے تھے۔ سر پر کناروں سے ادھڑا ہوا سرخ اسکارف بندھا تھا۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت پھیکی اور بے رونق تھی۔ آنکھیں بہت چمکیلی تھیں مگر ناک دبی ہوئی ایک ہاتھ مڑا ہوا اور منہ ٹیڑھا۔ جو ہنسی کی حالت میں بھیانک حد تک مزید خم کھا جاتا تھا۔ جو کوئی مولی کو دیکھتا اس کی حالت زار پر افسوس کیے بغیر نہ رہتا۔ ہر کوئی اس کی بے چارگی کی بات سوچتا مگر اس کی بے حسی بے چارگی کی وجہ کسی کو معلوم نہیں تھی حتیٰ کہ خود مولی کو پیدا کرنے والے اس کے ماں باپ کو بھی نہیں۔

شادی کے دس سال بعد جب مولی پیدا ہوئی تو زبردست خوشیاں منائی گئیں لیکن جس کسی نے آگے بڑھ کر نوزائیدہ مولی کو دیکھا خوف اور پریشانی سے آنکھیں موندیں۔ خوشی سے بے کل دل کو غم سے دبائے مولی کا باپ خود ایک کھمبے سے ٹکا سوچ رہا تھا یہ کیا ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟ کیوں ہو گیا؟ یہی سوچ کر اس کی دھڑکنیں بے قابو ہو رہی تھیں اور درد زہ کی تکلیف سے نیم بے ہوش مولی کی ماں سنبھل کر مولی کو دیکھنے کے بعد پھر سے بے ہوش ہو گئی۔

دادی نے بڑا منہ بنایا تھا اور سارے خاندان اور محلے والے مسرت بھری سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ ہر کوئی اپنی اپنی کہہ رہا تھا۔ مولی کے بے چارے ماں باپ ہکا بکا تھے۔ کیا قیامت گذر رہی تھی ان کی خلاصی کی وجہ تھی۔ ماں باپ دونوں اس فساد سے کٹ گئے تھے کیونکہ دونوں نے ایسا بچہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پہلے جب مولی کے دادا پنڈت کے ساتھ آئے اور ہر سال خاندان کو پھر مولی کو دیکھا دیکھ بٹ کے باوجود خود کو سنبھال کر اونچی آواز میں کہا۔

"جیسی پربھو کی مرضی!" تب انھوں نے مولی کے باپ کی پیٹھ پر تھپکی دی "یہ پرماتما کی مرضی میں کس کا دخل ہے بیٹا، اس کی جانب سے جیسے جیسا ملے اسے من کی شانتی سے سویکار کرنا چاہیے مت ڈرو مت رنجیدہ ہو، جاؤ پربھو کو نمسکار کرو!"

یہ سن کر بھنبھناتی ہوئی بھیڑ چھٹ گئی لوگ اکٹھے ہو کر طرح طرح کی بولیاں بول رہے تھے۔ دادا جی کی بات سن کر یکلخت خاموش ہو گئے۔ اپنے سینے میں تالا ڈال کر مولی کے باپ کی تقلید کرتے چلے گئے مولی کی غش کھائی ہوئی ماں نے آہستہ آہستہ ڈری ہوئی آنکھیں کھولیں تو دادا جی نے نرمی سے اسے بھی سمجھایا "کمزور لوگ ہمت ہارتے ہیں بہو۔ تم کمزور تو نہیں ہو۔ یہ بھگوان کی امانت ہے اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنا!"

بہو نے آنچل سے چہرہ ڈھک کر نیچے کانپتے ہوئے ہاتھ جوڑے اور نحیف آواز میں اقرار کیا

"جی بابو جی!"

یوں مولی خوف اور اجتناب کے گھیرے کو توڑ کر پیار کے ہالے میں پہنچی۔

سب سے پہلے دادا جی نے اسے گود میں اٹھایا۔ پھر تو سبھوں نے اسے باری باری گود میں بھرا اور حسب حیثیت اس کی مٹھی گرم کی۔ سب کے چلے جانے کے بعد دادی بولی۔

"بہو تو نے بے احتیاطی تو نہیں کی تھی؟"

"اس نے تو کچھ زیادہ ہی احتیاط کی تھی سمدھن۔ کیونکہ میں نے جتلا دیا تھا، پہلی بار احتیاط بہت ضروری ہوتی ہے!"

"پھر تو یہ کرموں کے کھیل ہیں جی!" دادی نے بڑا سا منہ بنایا۔

"کرم کون سے برے کیے ہیں بہن اس نے۔ کبھی ایک پتہ تک تو پیڑ سے نہیں توڑا۔"

اس کے سارے بہن بھائی پھول بنتے بھرا کرتے تھے پر موتی کی ماں نے تو بھول کر بھی کسی پیڑ پودے کا دل نہیں دکھایا۔ شوقین لوگ جب خوبصورت پنچھی خرید کر لاتے اور انھیں پنجروں میں بند کرتے تو موتی کی ماں رو رو کر بے حال ہو جاتی۔ سب کی منتیں کرتی کہ پنچھیوں کو قید نہ کرو چھوڑ دو، چھوڑ دو۔ اس حال پر بھی اب اس کے ساتھ ایسا ہوا ہے تو جانو سمدھی جی کا کہا سچ ہی ہے بہن، پر بھو کے کام پر بھو جانیں"۔

اتنا کہہ کر موتی کی نانی نے پلّو سے آنکھیں پونچھیں اور رام نام کا جپ کرنے لگیں۔

دادی نے بہت چاہا بے احتیاطی کا کوئی نہ کوئی الزام بہو پر عائد کر کے ہی رہے۔ موتی کو غلط کرموں کی سزا ٹھہرائے۔ مگر دادا جی گھنے سائبان کی طرح بہو کے سر پر پھیلے ہوئے تھے دادی کو اس کی بھی چڑ تھی کہ موتی کا باپ بھی ہمہ وقت شوخ نظروں سے موتی کی ماں کو تکا کرتا تھا حالانکہ دادی کے خیال کے مطابق بہادر مرد وہی ہوتا ہے جو شادی کے چند سال بعد ہی میلے کپڑے کی طرح عورت کی دھنائی کرنا شروع کر دے گر پنے تمام ترغصّے اور سوچ کے باوجود وہ بہو پر کوئی نہ کوئی تہمت لگانے کے اپنے کسی ارادے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ گھر بھر میں صرف وہی تھی جس نے بہت دنوں تک موتی کو ہاتھ نہیں لگایا مگر جیسے ہی موتی رینگنے لگی تو دادی کے چاہنے نہ چاہنے کی پروا کیے بغیر اپنے ٹیڑھے منہ سے رال ٹپکاتی خود دادی تک پہنچنے لگی۔ اور اپنی عجیب و غریب آواز کے ساتھ دادی کی دھوتی پکڑ پکڑ کر اچھپ اچھپ کرنے لگی۔ مجھے گود میں لے لو۔ مجھے گود میں لے لو۔ جیسے اپنا حق مانگنے لگی۔ مگر دادی نے موتی کو ہرگز نہیں چھوا دادی کو کترانا دیکھ کر دادا جی فوراً موتی کو اپنی باہوں میں بھر کر ہنگورے کی طرح جھلانے لگتے تو موتی اپنے ٹیڑھے منہ کے ساتھ کھلکھلا پڑتی۔ دادا جی نہال ہو جاتے۔ دادی کو جتلاتے۔

"سورگ سے آئی ہے میری موتی۔ جو کوئی اس سے نیچے گا اسے سورگ ہرگز نہیں ملے گا"۔

دادی کھینچ کر زہر بھری آنکھوں سے مسرور دادا پوتی کو دیکھتی اور سوچتی کتنا بھی اپنے خون کو چڑھائے بڈھا۔ رہے گا تو وہ نفس بھری ہی۔ اب یہ تو کہیں نہیں لکھا ہے کہ بچے کو سچ نہ کہو عیب کو عیب نہ جانو جیز گو پنی سہی پر اس سے اگر گھن آتی ہے تو گھن کرنے والے سے زیادہ کیا گھن دلانے والے کا قصور نہیں ہوتا؟۔

مگر مولی بالکل نہیں جانتی تھی اس کا قصور کیا ہے۔ اپنی بڑی مڑی ٹیڑھی شکل اور ٹیڑھے بدن کے ساتھ وہ اتنی ہی خوش و نہوم تھی جیسے دوسرے تمام صحت مند خوبصورت بچے۔

تمام دن گھر کے چھوٹے سے برآمدے اور صحن میں گھسٹتی پھرتی۔ وہ تمام چڑیاں جنہیں مولی کی ماں اور دادا جی ہر روز باقاعدگی سے دانہ کھلایا کرتے تھے بار بار مولی کے سر اور کندھوں پر آ بیٹھتیں اور اپنی زبان میں چہچہا چہچہا کر جیسے کہتیں۔

"مولی، مولی۔ کتنی پیاری ہو تم۔ کاش ہمارے ساتھ اُڑ سکتیں۔ ہم تمہیں دور دور لے جاتے میدان، پیڑ، پہاڑ دکھلاتے۔ کیا مزا آتا مولی! بہت مزا آتا۔"

چوڑے چوڑے میدان جو سب کا استقبال کرتے ہیں، ہرے بھرے پیڑ جو اپنی چھاؤں سب کو پیش کرتے رہتے ہیں، مضبوط پہاڑ جو ہر وقت مضبوط سپاہیوں کی طرح ڈٹے رہتے ہیں اور ٹھنڈے میٹھے چشمے جو ہر ایک کی پیاس بجھانے کے لیے ہر وقت چلتے رہتے ہیں۔

"دنیا کتنی پیاری ہے مولی۔ بہت بہت پیاری۔ بالکل تمہاری طرح۔ اس لیے خوب ہنسو، خوب گاؤ، خوب چہچہاؤ۔ ہماری طرح....."

تب ان کی لگاتار چوں چوں سے گھبرا کر کئی بار مولی اپنے چہرے کو ڈھک لیتی اور دادا جی جو پوجا پاٹھ کے بعد صرف مولی پر نظر رکھا کرتے، مولی کو اٹھا لے جاتے۔ رسوئی سے جھانک کر مولی کی ماں دادا جی کو احسان مندانہ تعظیم بھری نظروں سے دیکھ دیکھ کر ہلکا سا مسکراتی اور دوبارہ کام میں مصروف ہو جاتی۔

اسی اثنا میں جب مولی چھ سات سال کی ہو گئی تو ایک بہی خواہ نے دادا جی کو صلاح دی۔

"اب مولی کو اسکول بھجوا دیجیے۔"

یہ سن کر دادا جی ہڑبڑا گئے۔

"کیا مولی بھی اسکول جا سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں جناب۔ بے شک جا سکتی ہے۔ ایسے بچوں کے لیے الگ اسکول ہوا کرتے ہیں جہاں مولی کی طرح تمام "ری ٹارڈڈ" بچے ہی اسکول جاتے ہیں۔"

"کیسے بچے۔۔؟" دادا جی نے کچھ نہ سمجھ کر وضاحت چاہی۔

"ادھورے بچے جناب جو پیدائش سے ہی دماغی طور پر کمزور ہوتے ہیں جن کا دماغ پوری طرح بن نہیں پاتا، نامکمل ہوتا ہے!"

یہ سن کر داداجی تمام جان سے تڑپ گئے۔ امنڈتے ہوئے آنسو پی کر بولے "اچھا، کہاں ہے وہ اسکول؟ لیکن میرا دل اپنی موتی کو کہیں بھجوانا نہیں چاہتا میاں۔ اگر وہاں اس کی ٹھیک طرح دیکھ بھال نہ ہوئی، وہ گر کر چوٹ لگا بیٹھی تو؟"

"ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا جناب۔ یہ محض آپ کے خدشات ہیں۔ اگر یقین نہیں تو ایک بار میرے ساتھ چل کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے وہاں کا انتظام"۔

تب داداجی آمادہ ہوئے اور اگلے روز جب اپنے پڑوسی کے ساتھ اسکول روانہ ہوئے تو راستے میں آواز دبا کر دریافت کیا انھوں نے۔ "آپ نے کیا کہا تھا میاں صاحب کیسے ہوتے ہیں ایسے بچے۔؟"

"ری ٹارڈڈ جناب، جن کا دماغ مکمل بنا ہوا نہیں ہوتا اور جن میں پیدائشی جسمانی نقص بھی ہوتے ہیں!"

"ری ٹارڈڈ....." داداجی نے اس لفظ کو دہرایا تو جیسے ان کی زبان کٹ گئی۔ زخمی ہوگئی۔ "ہے بھگوان میری موتی کو ایسا یوں ہونا تھا۔ کچھ بھی ہو پربھو آپ اسے ٹھیک کر دینا وہ چاہے اسکول میں پڑھے نہ پڑھے لیکن اپنی گرہستی ضرور سنبھال لے اسے اس قابل ضرور بنا دینا پربھو —— ضرور ——"

ہاتھ جوڑ کر داداجی نے من ہی من سپنے پربھو کو پرنام کیا، اور بھرائی ہوئی آنکھوں سے طے ہوتا ہوا راستہ تکتے رہے۔

اسکول میں داخل ہوتے ہوئے داداجی کا دل بے تحاشا ڈگر مگر کر رہا تھا۔ موتی کو لمحہ بھر بھی اپنی نگاہوں سے دور کرنے کا خیال ان کے لیے سخت سوہان روح تھا مگر ان کے ہمی خواہ پڑوسی نے انھیں سمجھایا کہ اسکول جا کر موتی کچھ حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے وہاں ایسے بچوں کو صحت یابی کی مختلف مشقیں کرائی جاتی ہیں۔ خاص خاص طریقوں سے ایسی ورزشیں جو ان کی درستگی میں مددگار ہو سکتی ہیں۔ بس اسی بات نے داداجی کا من تھام لیا اور اسکول میں جب

بہت سے بچوں کو انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے کھیلتے کودتے، طرح طرح کی مشقیں کرتے دیکھ لیا تو بے حد اطمینان سے فوراً مولی کا نام اسکول میں داخلے کے لیے خوشی خوشی لکھوا دیا اور لوٹتے وقت پرنسپل صاحبہ سے درخواست کرنا نہ بھولے "میری مولی کو مارنا مت میڈم، اس کا دھیان رکھنا، بڑی کومل ہے وہ۔ اگر کبھی غصے سے ڈر گئی تو اس کا ننھا دل ٹوٹ جائے گا میں آپ کے پاؤں چھوتا ہوں میری مولی کو بس شاخ کا پھول ہی سمجھنا!"

پرنسپل صاحبہ نے داداجی کے ہاتھ تھام کر انھیں ڈھارس بندھائی۔ گھر لوٹ کر داداجی نے دوبارہ بھگوان کے چرنوں میں پھول چڑھائے، اور دل کی گہرائیوں سے پرارتھنا کی۔ "ہے پربھو مولی کے سر سے اپنا ہاتھ نہ ہٹانا اسے ہمیشہ اپنی چھایا میں رکھنا"

اور اگلے روز سے مولی اسکول جانے لگی۔ وہ خوش خوش جاتی خوش خوش واپس آتی لیکن ایسے تمام بچوں کی طرح مولی بھی موڈی تھی۔ جی ہوا تو کچھ کیا نہیں تو گم صم گمبھیر بنی رہتی۔

خود کو تسلّی دینے پر بھی مولی کو اسکول بھجوا کر کچھ دنوں داداجی پریشان رہے۔ صبح مولی کو اسکول بس میں چڑھاتے وقت داداجی کا دل طوفان میل کی رفتار پکڑ لیتا، لیکن سہ پہر کو بس سے مولی کو اتارتے وقت پورا سورج صرف داداجی کے چہرے پر آکر ٹھہر جاتا جگمگاتا ہوا۔

رفتہ رفتہ تمام خوف اور خدشات داداجی کے دل سے دور ہو گئے۔ اب وہ پورے اعتماد سے مولی کو اسکول بھجواتے اور امید سے مستقبل کی طرف دیکھتے رہتے۔ اپنی پنشن میں سے آدھی رقم دادی کو دینے کے بعد بقیہ آدھی رقم بلا تامل وہ مولی کے حساب میں جمع کر دیتے تھے۔ پیسے بہت کم رکھتے، دو آنے جانے والوں پر بھی بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرتے، نہایت ضروری حالت میں۔ اب انھیں صرف مولی کے بیاہ کا انتظار تھا۔ مولی کا بیاہ وہ اپنی بساط سے زیادہ عمدگی سے کرنا چاہتے تھے۔

مولی ہر طرح خوش تھی لیکن اس کی ایک ہی خواہش تھی جو پوری نہیں ہو رہی تھی۔ اسکول بس میں ڈرائیور کی سیٹ کے بعد والی پہلی سیٹ پر آیا ارملا بیٹھتی تھی جس کے ساتھ ہمیشہ یوسو کرتی پھر پچھلی تمام سیٹوں پر انشو، ندھی، پنکج، گوتم، پدما، رما، ثمینہ، شکیلہ، انور، شیوانگی، کمال اور خود مولی اور باقی سبھی بچے بیٹھتے تھے۔ مولی کا بڑا جی تھا کہ آنٹی ارملا کے ساتھ وہ بھی

سب سے اگلی سیٹ پر بیٹھنے کا فخر و اعزاز حاصل کرے مگر ڈر کے مارے اس نے کبھی آنٹی ارملا کو اپنی یہ خواہش نہ بتلائی نہ ہی دادا جی سے اس سلسلے میں کوئی مدد لی بلکہ کئی روز تک ہمت جمع کرنے کے بعد ایک صبح بس میں داخل ہونے کے بعد خود ہی گھسٹتی ہوئی آنٹی ارملا کے بازو سب سے پہلی والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ آنٹی ارملا نے اسے سہارا دے کر مسکرا کر دیکھا اور بس چل پڑی۔

مولی کا دل منوں مسرت سے بھر گیا جیسے وہ اسکول بس کی اگلی سیٹ پر نہ بیٹھی ہو بلکہ کسی ہوائی جہاز کی انتہائی شاندار سیٹ پر بیٹھی ہو۔ جلدی جلدی سانسیں لے کر وہ اندر ہی اندر کھلکھلا پڑی۔ آہا۔ آہا۔ آہا!!!

بس میں پیچھے بیٹھے ہوئے تمام بچے اس وقت مولی کو بے جان گڈے گڑیوں کی طرح لگے۔ وقت کے اس خاص لمحے میں اپنی تمنا کے ساتھ جیسے وہی زندہ و پائندہ تھی مسرت سے مکمل طور پر ہم کنار۔ کہ دوڑتی بھاگتی ہوئی بس ایک جھٹکے سے اگلے اسٹاپ پر ٹھہری اپنے ننھے پاؤں میں دودھ ایسے سفید موزے جوتے پہنے سبز قیمتی فراک میں ملبوس سفید براق سویٹر پہنے۔ کناروں پر خوبصورت کڑھائی کیا ہوا عمدہ اسکارف سر پر باندھے آنکھوں کو متواتر جھپکاتی ایک جانب ڈھلکے ہوئے سر کے ساتھ ایوا نے جوں ہی بس میں قدم رکھا آنٹی ارملا نے مولی کا ہاتھ تھام کر اسے کسی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا اور احتیاط سے ایوا کو تھام کر ہمیشہ کی طرح پہلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ بس روانہ ہو گئی۔ آنٹی ارملا نے مولی کی مدھم ہوتی ہوئی آنکھوں کو اور اداس چہرے کو سرسری نظر سے دیکھا اور اگلے ہی پل پیارے ایوا کی جانب دیکھنے لگی۔ بیچاری مولی ذرا بھی نہیں جان پائی کہ اس وقت آنٹی ارملا کی نظر میں ایوا کا چہرہ نہیں تھا بلکہ اس کی ماں کے دیے ہوئے کرارے نوٹ چمک رہے تھے جو زندگی کی چلچلاتی دھوپ میں کھڑی ارملا کو کسی اور طرف نہ دیکھنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ وہ بھی کہہ رہی تھی کہ ایوا کی ٹیڑھی میڑھی شخصیت کو نہ دیکھ کر صرف اس کے قیمتی لباس کو دیکھا کرتی جس پر افلاس کی دھول کا ایک ذرہ بھی نہ تھا۔ ایوا کی ذات ارملا کے لیے اس راستے کی طرح تھی جس سے خوش تبدیلیاں زندگی میں داخل ہو سکتی ہیں۔

"کاش میں ایوا ہوتی۔ ایوا....." مولی اپنے ٹھٹھرے ہوئے دماغ پر زور ڈال کر خواہش کر رہی تھی اور اس کی بے آواز سسکیاں ابھر ابھر کر دب رہی تھیں گھٹ رہی تھیں کوئی انھیں سننے والا نہیں تھا۔ بس اندھا دھند دوڑ رہی تھی گرد و غبار اڑاتی بے بس راستوں کو کچلتی ہوئی۔

شیشے کی دیوار

بھیا کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ شیروانی کھونٹی سے ٹانگتے ہوئے بولے "تو ایک پیالی گرم چائے تو لا دو"

میں باورچی خانے میں گئی۔ آپا ہنڈی بھون رہی تھیں میں نے کہا "آپا جلدی سے ایک پیالہ گرم چائے تو بنا دو"

"تمھیں تو ہر وقت چائے کی پڑی رہتی ہے" آپا ناگواری سے بولیں۔ میں نے کہا "میرے لیے نہیں بھیا کے لیے، اُن کا جی اچھا نہیں"

"کیا ہوا ہے" آپا نے جلدی سے کیتلی چولہے پر رکھی اور بھیا کے کمرے کی طرف دوڑ گئیں واپسی پر ان کے ہاتھ پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے کام کرنے لگے۔

بڑے بڑے چائے کے گھونٹ لے کر چائے ختم کرنے کے بعد بھیا نے کہا "تو ذرا مجھے لحاف تو اڑھا دو" اور لحاف اڑھاتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ بھیا کا بدن کانپ رہا ہے۔

"بخار تیز ہے بھیا دوائی لے آؤں" میں نے آہستہ سے کہا۔

"تھوڑا سا ہے فکر کی کوئی بات نہیں" بھیا نے دھیرے سے جواب دیا۔

"فکر کی بات کیسے نہیں" دروازے پر کھڑی آپا بولیں "آپ تو اپنا خیال ہی نہیں رکھتے۔ کام، کام کام اور فکریں .... آخر آپ سوچتے کیوں نہیں کہ ...."

بھیا نے لحاف منہ پر کھینچ لیا اور دیوار کی طرف پلٹ گئے۔ آپا وہاں سی کھڑی رہیں۔

مجھے ایکایک گذرے ہوئے دن یاد آ گئے ۔ بے فکری ہی بے فکری ۔ فراغت ہی فراغت ۔ مصیبت تو بڑی آپا کی شادی سے شروع ہوئی ۔ ذاتی گھر رہن ہوا ۔ کرایے کے گھر میں اٹھ آنا پڑا ۔ پھر اپنا گھر چھڑانے کے بجائے ابا مقروض ہوتے ہی گئے ۔ بس اماں کی ضد تھی، گھر کا پہلا کام دھوم دھام سے ہو، محلے بھر میں، بلکہ دنیا بھر میں شہرت، نیک نامی اور سلیقہ شعاری کے ڈنکے بجیں، سو تو بج گئے ۔ بڑی آپا کی شادی کا تذکرہ آج ہر زبان پر تھا لیکن اس کے بعد کی مصیبت صرف ہمارا حصہ جس کا حال کسی اور کو معلوم نہیں ۔ ابا کی پنشن لگ گئی ۔ بھیا ابھی پڑھ رہے تھے ۔ آپا رانی سے بہت بن چکی تھیں ۔ میں خود بھی محسوس کر رہی تھی کہ مجھ میں کئی تبدیلیاں آ چکیں ــــ سب سے بڑھ کر ہمیشہ شائستگی سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے والے امی ابا اب ہر وقت چلا چلا کر ایک دوسرے کو الزام دیتے رہتے ۔ ابا کہتے تمھاری ضد نے یہ حالوں پہنچایا ۔ بے جا نام و نمود کی خواہش اور دنیا پسندی ۔ امی کہتیں اگر تم ہی اتنے عقلمند ہوتے تو یہ نیا ڈوبتی ہی کیوں ۔ اس وقت ہی کیوں نہ سمجھایا ۔ کسی کے کہنے سے آدمی اپنی عقل تہہ کر کے تو نہیں رکھ دیتا ۔

اس بے تکی تکرار سے ہم سہمے سہمے، متاثر رہتے جیسے آپا نے کچھ کھو دیا ہو ۔ بھیا مستقبل کی سمت بڑھتے ہوئے بھی پشیمان اور رنجیدہ ہوں اور میں ــــ

دنیا غلط نہیں کہتی حقائق سے دو بدو ہونے کا احساس کم عمری میں بھی زہر گھول دیتا ہے ۔ اپنی دانست میں میں خود کو ایک ایسی ہستی متصور کرتی جس کے کاندھوں پر ذمہ داری کا بھاری بوجھ ہو حالانکہ بھیا ہمیشہ کہتے ۔ تمھیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ۔ ابا بھی کبھی کبھی اچانک محسوس کر لیتے یہ شوخیاں کیوں نہیں کرتی، اتنا خاموش کیوں رہتی ہے ؟ اماں اور آپا نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ کر رہ جاتیں ۔

پھر ایک دن اماں نے بھیا سے کہا ۔ "تم کیسے بھائی ہو، اپنی بہنوں کے لیے اچھے بر بھی نہیں ڈھونڈ سکتے ؟"

" بر تو ہر وقت مل سکتے ہیں امی لیکن ــــ" بھیا بولتے بولتے رک جاتے ۔ گہری خاموشی ہر طرف پھیل جاتی جیسے بہت سے بادل برسے بغیر اپنے کالے کالے پنکھ پھیلائے ہم سب کے سروں پر چھا گئے ہوں ۔ امی کی آنکھیں ماند پڑ جاتیں ۔ ابا حقے کے کش لگا لگا کر تکتی دیوار پر

کو گھورنے لگتے ۔ آپا کے چہرے کا اجالا کھو جاتا ۔

"اس گھر میں تو محسوس ہوتا ہے دم ہی گھٹ جائے گا اور کسی کو خبر نہ ہو گی۔" ابا کا تنفس تیز ہو جاتا، امی کی جھلاہٹ بڑھ جاتی۔ "تم مکان دار سے کہتے کیوں نہیں ہم انسان ہیں جانور نہیں۔ رکھنے والے تو جانوروں کے گھر بھی اس سے اچھی حالت میں رکھ لیتے ہیں۔" امی کو ایک دم زندگی کی اچھی حالتیں یاد آنے لگتیں۔ ابا حقہ چھوڑ کر اٹھ جاتے بھیا دوسرے کمرے میں سرک جاتے اور میں چپ چاپ سوچا کرتی، زندگی آخر کس رخ بہہ رہی ہے۔ بہت زیادہ خاموشی چھا جانے پر آپا بوجھل سکوت کو توڑنے یوں ہی پوچھ لیتیں۔

"سب کام ہو گیا تو، برتن صاف کر لیے، صفائی کر لی؟" میں کافی روکھائی اور صفائی سے کہتی "ہاں آپا" اور آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ کہاں وہ دن کہ کام کرنے والے دو دو تین تین نوکر ہر وقت موجود ہوا کرتے اور کہاں یہ زمانہ کہ میں جو سب سے چھوٹی گھر کی لاڈلی ہمیشہ کی کام چور، اب صحن و دالان کو جھاڑو تک لگاتی، چھت سے جالے اتارتی، فرش دھوتی، سبزی بناتی، چاول بینتی، پھر بھی امی ہمیشہ شکایت کرتیں کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوتا زندگی اس طرح کیسے گذرے گی۔

ایسے ہی بے کیف شب و روز میں ایک دن بھیا نے پکار کر کہا "انو آج دو پیالی چائے ــــ" تو میں حیران رہ گئی۔

"دو کیوں بھیا آج آپ دو پیالے پئیں گے کیا؟"

بھیا نے اپنے کمرے کی چق اٹھائی اور آہستہ سے بولے "میرے ساتھ دانش بھی ہے آج!"

"کون دانش" میں نے بڑی جستجو سے بھیا کے کمرے میں جھانکا۔ ایک ہونق سا انسان کرسی پہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت تو مجھے بالکل ایسا ہی محسوس ہوا جیسے یہ آدمی دھات کا بنا ہوا ہے جو کچھ بول نہیں سکتا، جو کچھ سمجھ نہیں سکتا لیکن ــــ کچھ ہی دیر کے بعد اس کی ہنسی گونجی تو یکایک محسوس ہوا کہ سارا گھر خوشیوں سے بھر گیا۔ میں دوڑی دوڑی باورچی خانے میں گئی اور مسکرا کر بولی۔

"آپا ایک نہیں دو پیالے چائے آج"۔ آپ کے ماتھے پر سلوٹیں ابھر آئیں — "تجھے چاہیے؟"

"نہیں" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "دانش کے لیے"۔

"کون دانش؟" آپا ہکا بکا میری طرف دیکھنے لگیں۔

"وہ جو سب کو علم و عقل سکھاتا ہے لیکن شکل سے ایک دم یتیم معلوم ہوتا ہے اور مجھے ڈر ہے آپا..... ہا..... میں قہقہے لگانے لگی۔ آپا کیتلی چولہے پر چھوڑ باہر والے کمرے کی طرف بھاگیں پھر آنچل منہ میں ٹھونسے ہنسی روکتی ہوئی آئیں اور خاموشی سے چائے بنانے لگیں جب میں چائے لے کر باہر گئی تو بھیا نے بڑے نرم لہجے میں تعارف کرایا — "یہ میری بہن انیس ہے، دانش۔ اور یہ میرا دوست ہے بھئی —"

دانش کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ ایک تھرتھراتے ہوئے ہاتھ نے پیالہ اٹھالیا اور بس۔

پھر تو دانش اکثر ہمارے یہاں آنے لگا اور بھیا دبی دبی زبان میں سب کو جتانے لگے، بہت بڑے گھر کا لڑکا ہے۔ اسے کسی چیز کی کمی نہیں۔ وہ تو بس دوستی کی خاطر آتا ہے اور، اور...... لیکن امی کو دوستی کا مطلق احساس نہیں تھا۔ انھوں نے اپنے زمانے میں اسکولوں میں تعلیم نہیں پائی تھیں سکھی سہیلیاں نہیں بنائی تھیں۔ کسی جذبے کی اپنے دل میں پرورش و حفاظت نہیں کی تھی بلکہ جب پیا بے دھن جن بڑے گھر اٹھ آئی تھیں لہٰذا بھیا سے بولیں "تم کہتے ہو خوش حال گھر کا ہے اور تمھارا دوست بھی ہے تو پھر اپنی بہن کے بارے میں سوچتے کیوں نہیں"۔

"ارے" بھیا نروس ہوگئے۔

"ہائے اتنی سڑی بسی شکل —!" میں نے منہ بسورا۔ مجھے آپا کے نصیب پر رونا آنے لگا۔

"لڑکے کی شکل کون دیکھتا ہے پگلی"۔ امی نے مجھے تنبیہ کی۔ بھیا کچھ کہے بغیر اٹھ کھڑے ہوئے اور میں نے بستر پر گٹھری ہوئی آپا کو گدگدا کر پوچھا۔ "تمھیں حسن چاہیے یا عقل آپا"؟

آپا نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

امی کو دانش بہت پسند آگیا ہے۔ میں نے انکشاف کیا۔

"چھی بکواس نہ کر"۔ آپا نے تکیے میں منہ چھپالیا۔ جانے ہنس پڑیں یا بسورنے لگیں لیکن میں

اچانک تبدیلی آگئی۔ مرجھائے ہوئے چہرے پر سرخی سی نظر آنے لگی۔ مدھم مدھم خدوخال کچھ لو سی دینے لگے۔ کیتلی ہر دم چولہے پر رہنے لگی۔ جانے کب چائے مانگ لی جائے اور امّی کی صافی سے پکے پکے پان بھی چرائے جانے لگے۔ مانگنے پر چائے اس سلیقے سے بھیجی جانے لگی کہ اپنے حصے کے مٹھائی اور پھل بھی رکھے جانے لگے۔ چولہے کی گھٹی ہوئی فضا سے نکل کر آپا اکثر آئینے کے سامنے بھی نظر آنے لگیں۔ ہائے آپا، تم اس سڑیل شکل کے لڑکے کے ساتھ اتنی راضی ہو۔ میں سوچتی ہوں وہ تمھاری خوبصورتی کا بھرم کیا ہوا۔ کیا اس دنیا میں پیسہ ہی خدا ہے۔

ادھر امّی بھیّا سے برابر کہے جارہی تھیں، "تم دانش سے بات تو کرو ایک بہن کا بوجھ تو ہلکا ہو۔"

بھیّا ٹالتے جارہے تھے لیکن سنتے سنتے ایک شام انھیں غصہ آگیا۔ چلاّ کر بولے: "میں دانش سے یہ بات کبھی نہیں کہوں گا۔ وہ میرا دوست ہے، اور میں اتنا خود غرض کمینہ نہیں کہ اس کے پیسے پر نظر رکھوں۔"

ابّا پریشان ہوگئے۔

"جو وقت میں نہ کام آئے تمھارا ایسے دوستوں سے کسی کو فائدہ نہ پہنچے ایسی دوستی سے کیا حاصل؟" امّی نے بھی چیخ کر کہا۔

"اب تم بھی بس اچھی، میں یہ ذلت سہہ سکتی ہوں امّی۔" بھیّا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، "مجھے اپنی بہن کی بے عزتی منظور نہیں۔"

"اور یہ بڑی عزت کی بات ہے کہ بہنیں پڑی سڑتی رہیں۔" امّی نے صاف صاف کہہ دیا "تم نہ کہو میں خود اس سے بات کروں گی۔"

"نہیں امّی" بھیّا کی آواز کانپ گئی۔ آپا بے چین ہوگئیں۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ کہیں دانش انکار ہی نہ کردے۔ پھر تو آپا اور بھیّا کے لیے ڈوب مرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا۔

"آپ دانش کو گھر ہی نہ لائیں۔" میں نے بھیّا کو سمجھایا۔ بھیّا کشمکش و پیچ میں پڑ گئے۔ "کیسے منع کردوں، وہ یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ اس کا آنا پسند نہیں کیا جارہا ہے۔"

"اگر آپا کی قسمت یہی ہے تو وہ خود یہ بات کہہ سکتا ہے بھیّا۔" اور رات بھر کے جاگے ہوئے بھیّا اسی کشمکش میں کالج چلے گئے لیکن آدھے ہی دن سے لوٹ آئے۔ انھیں کتنا تیز بخار ہو رہا تھا۔

مجھے رہ رہ کر امّی پر غصّہ آ رہا تھا۔ بھیّا کے پیچھے ابّا بھی دبی زبان سے کہہ چکے تھے۔ لڑکے کو پریشان نہ کرو۔ اتنی جلدی کیا ہے۔ بچیوں کا خدا مالک ہے لیکن امّی اپنی ہی دھن میں تھیں اور آپا ہمیشہ سے زیادہ خاموش ــــ بے شک آپا زندگی چاہتی ہوں گی۔ اپنا گھر، ساتھی آرام آسائش لیکن...

بھیّا نے لحاف سرکا کر ایک بار آہستہ سے پوچھا "دانش آ گیا؟" میں نے ہولے سے کہا "نہیں"۔ ابّا نکڑ والے ڈاکٹر کے پاس سے دوا لے آئے۔ امّی نے سکون سے کہا "موسم کا بخار ہے اتر جائے گا"

دفعتاً دانش نے آواز دی "آ جاؤں؟"

میں نے خوف زدہ ہو کر آپا کی طرف دیکھا لیکن وہ اوٹ میں ہونے کی بجائے خلافِ وضع چق کی طرف بڑھیں "آ جائیے" انھوں نے مدّھم آواز میں کہا۔ غصّے سے میرا دم الٹنے لگا۔ آخر آپا کو بھیّا کا خیال کیوں نہیں۔ ان کی عزّت کا پاس و لحاظ ـــ ؟ اور دانش چق اٹھا کر اندر آ گیا۔ آپا کو دیکھ کر ٹھٹکا پھر پلٹنے ہی والا تھا کہ آپا نے خود کہا۔ "بھائی کے دوست بھی تو بھائی ہی ہوتے ہیں پھر بھائی سے پردہ کیسا ـ ؟"

امّی بجلی بھرے بادل کی طرح کڑکیں "نابکار......

بھیّا چونک گئے آپا تیزی سے اندر کی طرف چلی جا رہی تھیں۔ کسی نے دیکھا یا نہیں مگر میں نے ضرور دیکھ لیا کہ آپا کے چہرے کے نقوش تیزی سے بدل رہے تھے جیسے کسی خوبصورت تصویر پر روشنائی کے داغ پھیل گئے ہوں اور شیشے کی وہ دیوار جو لمحے بھر پہلے میرے اور آپا کے درمیان کھڑی ہو گئی تھی چھن سے زمین پر آ رہی۔ خود میری آنکھیں تیزی سے بھیگنے لگیں۔

میری ممتا

دھول کے بگولے کے ساتھ ونایک میدان میں نمودار ہوا تو امچور کترتی ہوئی ریشمی بڑے ضابطے سے بولی۔

"کمائی ——"

ونایک نے جواب دینے کی بجائے تھیلہ ایک طرف کھڑکیا ترازو اور پیسوں کا صندوق اندر کوٹھری میں لے گیا۔ تب باہر آکر تہہ بند جھٹکا پھر مٹی پر بچھی ہوئی میلی چٹائی پر ٹانگیں پسار کر لیٹ گیا۔

چٹائی کے قریب بیٹھی ہوئی ریشمی نے پھر اپنا سوال دوہرایا۔

"آج کی کمائی —— ؟"

ریشمی یہ سوال ہر روز بڑی باقاعدگی سے پوچھا کرتی تھی۔ اسی سوال سے تھک کر ریشمی کا بڑا لڑکا بابو اس سے الگ ہو چکا تھا اور اب ونایک تھا جو لستے کی دھول کی طرح اس سوال کو چپ چاپ برداشت کر رہا تھا۔ جب ریشمی نے تیسری بار یہ سوال دوہرایا تو جھنجھلا کر ونایک بولا —— "چپ رہ، بڑے بھائی کو بھگا کر چین نہیں ملا، جو اب میرے پیچھے پڑی ہے"، لیکن ریشمی اس دھمکی سے خاموش نہیں ہوئی۔ "تیرے باپ کی کمائی نہیں کبھی ہوئی ہے میرے پاس سمجھا۔" ریشمی نے اپنے کس بل والے جسم کو جو اب زیادہ عمر کی وجہ سے ڈھلک گیا تھا، تیز حرکت دی۔

"باپ کا نام نہ لے ورنہ......" ونایک نے غصّے سے ریشمی کی طرف دیکھا۔

"لوں گی، برابر لوں گی۔ سو وقت بولوں گی بھگوڑا ــــ بھگوڑا ــــ بھگوڑا....."

"تو نے ہی اسے بھگایا ہے اب بکھان کیوں کر رہی ہے۔"

چٹائی سے اٹھ کر ونایک نے ریشمی کے بال پکڑ لیے اور اس کے پیروں کے چکروں کے ساتھ ساتھ دھول کے بڑے بڑے مرغولے میدان میں پھیلنے لگے۔ راہ چلتے لوگ تماشہ دیکھنے کی غرض سے آ جمع ہوئے۔

"ارے ارے بوڑھی کو کیوں ملتا ہے۔"

"کیسا بیٹا ہے تو اپنی ماں پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔"

"کیا زمانہ آ گیا ہے یار ذرا بڑے بوڑھوں کا کہیں احترام نہیں۔"

"بڑی جنگلی قوم ہے۔ بھئی شہر آ کر بھی نہیں سدھر سکی۔"

ان تمام باتوں سے بے پروا ونایک ماں کو دھڑا دھڑ پیٹتا رہا۔" اگر اب کی بار تو نے میرے باپ کو بھگوڑا کہا تو دیکھ لینا پھر ــــ"

اور مار کھاتی ہوئی ریشمی برابر ونایک کی جیبیں ٹٹولتی رہی۔" بتا کتنا لایا ہے آج، اندر والی جیب میں چھپا کر رکھا ہے نا ــــ؟"

کالے بابو نے آ کر پہلے تو تماش بینوں کو بھگایا پھر ماں بیٹے کا تصفیہ چکایا۔

"مت لڑ موسی کیوں تماشہ بنتی ہے۔"

"میں اپنے مرد کو گالیاں دوں تو اس کا کیا بگڑتا ہے پوچھ ذرا ــــ۔۔"

"تیرا مرد میرا باپ ہے سمجھی" ونایک غرّایا اور دوبارہ ریشمی کی طرف جھپٹا مگر ریشمی آگے بڑھ گئی۔ ونایک کی جیبیں بالکل خالی تھیں۔ ریشمی نے اچھی طرح ٹٹول کر دیکھ لیا تھا بدن کے ایک ایک جوڑ کو سہلاتے ہوئے ریشمی نے اچور کی تتر بتر ڈھیری سمیٹ کر ٹوکری میں جمع کی اور ٹوکری کوٹھری میں رکھ کر آنے کے بعد دکھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کنگال جیسے دارو پیوں گی۔"

ونایک نے گھور کر ریشمی کو دیکھا پھر تھوڑی دیر سے آنسو آنے لگا ان رہا گیا نہ تھمی

رکھ دیے۔

"میں تو پورا روپیہ لوں گی" ریشمی مچلی تو دنایک نے مجبوراً پورا ایک روپیہ اس کی پھیلی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

"اب دفع ہو یہاں سے" وہ بھنّا کر بولا اور چٹائی پر لیٹ گیا۔ دن بھر گلی گلی گھومنے کے بعد وہ بے حد تھک گیا تھا۔ جب روپیہ مٹھی میں دبائے ریشمی دارو کی دکان کی طرف چل دی تو کروٹ بدل کر دنایک نے بازو میں بیٹھے ہوئے کالے بابو سے کہا۔

"چل یار آج ذرا "سی نما" دیکھیں ——"

کالے بابو نے بیڑی کا دھواں اپنے کھو کھلے سینے سے باہر اگل کر کہا۔ —"نہیں موسی گالیاں دے گی پھر"

"چولہے میں جائے تیری موسی۔ اتنا کیوں ڈرتا ہے"

"تو اسے بہت مارتا ہے دنایک" کالے بابو نے دفعتاً شکایت کی۔

"نہ ماروں تو وہ ناگن میری ہڈیاں بھی ڈس لے"

"لیکن کچھ تو اس کے بڑھاپے کا خیال کر"

"بوڑھی ہو گئی مگر پیسے کا لالچ کم نہ ہوا۔ آخر کب تک بھرتا جاؤں اسے۔ کچھ اپنے لیے بھی رکھوں کہ نہیں"

"پیسہ تو ان کی پرانی کمزوری ہے دنایک"

کالے بابو کو اپنا باپ یاد آیا جو بہت سے مریل مریل مرگھلے بچوں کو پیدا کر کے چور بن گیا تھا کالے بابو نے اسے کتنی بار سمجھایا۔ تم فکر مت کرو بابو میں سب کو سنبھال لوں گا، پال لوں گا مگر اس کے باپ نے چوری نہ چھوڑی۔ اب سلاخوں کے پیچھے بند نگاہ حسرت سے دنیا کو دیکھ رہا تھا اور یہ "نگاہ" کالے بابو کے ذہن سے کوشش کے باوجود محو نہ ہوتی تھی۔ اس نگاہ کی حسرت اس کی بے چارگی ایک زخم کی طرح کالے بابو سے چمٹ کر رہ گئی تھی۔

"چل نا یار ——" دنایک اٹھ کھڑا ہوا اور وجینتی مالا کی پکچر دیکھ کر جب دونوں واپس لوٹے تو کوٹھری کے سامنے ریشمی شیرنی کی طرح چوکس بیٹھی ہوئی تھی۔

"حرامی پھر سی نما گیا تھا نا ۔۔۔؟" وہ غرّائی "ہاں گیا تھا تو ۔۔۔؟"

اس بار ریشمی نے ایک جھاپڑ ونایک کے منہ پر مارا ۔۔۔ "مجھے پیسے نہیں دیتا سی نما میں کیا تیرا سالا بیٹھا ہوا ہے جو سب کچھ وہیں پھونک آتا ہے ۔۔۔ آخر تیری شادی کے لیے کپڑے لتّے کس طرح بناؤں۔"

شادی کے ذکر پر ونایک کا غصہ کچھ ٹھنڈا پڑا۔ وہ ریشمی کا ہاتھ مروڑتے ہوئے بولا۔

"اچھا اب ہلّڑ نہ مچا، سونے دے نیند بہت آرہی ہے۔"

"میں کہتی ہوں پہلے آج کا حساب بتا۔" ریشمی دہاڑی۔

"لے ۔۔۔" ونایک نے جیب الٹ دی تہہ بند کی گرہ کھول کر دکھا دی۔

"سب پیسے ختم ہو گئے اور آج کی بچت میں کچھ نہیں پڑا۔؟ میری میّا ۔۔۔۔"

ریشمی خالی ڈبّے کی طرح زمین پر لڑھک گئی اور زور زور سے رونے لگی۔

"میں اس چھوکرے کو کیسے سمجھاؤں کیسے ۔۔۔۔"

"بھگوان کے لیے چپ رہ موسی" کالے بابو نے بیڑی پاؤں تلے مسل ڈالی ۔۔۔" ونایک دارو تک تو نہیں پیتا۔ چپ ہو جا۔ دن بھر محنت کرنے والوں کی نیند مت خراب کر موسی۔"

مگر ریشمی چلّاتی رہی۔

"اٹھنے دے سب لوگوں کو، میں سب کو بتاؤں گی۔ میرا بیٹا غنڈہ، بدمعاش لفنگا ہو گیا ہے۔ کمائی کر کے سب اڑا دیتا ہے ایک پیسہ بھی لا کر مجھے نہیں دیتا۔ میری میّا بالکل باپ کے قدم بہ قدم چل رہا ہے۔"

وہ چلّاتی رہی اور ونایک اس کی چیخوں اور کالے بابو کی خوشامدوں سے بے خبر چٹائی پر گر کر اونچے اونچے خرّاٹے لینے لگا۔ خوب شور مچانے کے بعد ریشمی نے اپنے بدن کے دکھتے ہوئے حصوں کو ہلدی اور چونے کا لیپ لگایا اور خود بھی چٹائی پر ونایک کے بازو پڑ رہی۔

صبح جب چڑیوں نے چہچہانا شروع کیا تو ریشمی اٹھی۔ میونسپلٹی کے نلکے پر سے کلّی کر کے پان کلّے میں دبایا۔ کوٹھری میں جا کر اڑیوں سے پکتے پکتے آم ٹٹول کر نکالے

سڑے گلے آم چھانٹے۔ ٹھیلے پر رنگین کاغذ بچھاکر پکے پکے سنہرے آموں کی ننھی ننھی ڈھیریاں لگائیں۔ ترازو اور پیسوں کا صندوق ٹھیلے کے دوسرے کونے پر سجایا۔ اتنا کرکے اس نے دیوار سے اوپلے چنے، چولہا گرم کیا، جوار کی موٹی موٹی روٹیاں گڑھیں۔ لہسن اور ہری مرچ کی چٹنی کوٹی تب وِنایک کے پاس پہنچی ۔"او ہتھیارے اٹھتا کیوں نہیں ـــ" ہتھیارے نے اٹھنے کی بجائے ایک زوردار جماہی لی اور پھر کروٹ بدل کر اطمینان سے سونے لگا۔ تڑ تڑ۔ ریشمی نے اس کی کمر پر دو تین گھونسے رسید کیے ـــ" اٹھ۔ صبح ہو گئی ـــ"

ونایک نے آنکھیں کھولیں تو صبح واقعی مسکرا رہی تھی۔ اس مسکراہٹ کی تازگی نے ونایک کے انگ انگ میں پھرتی بھر دی۔ جلدی سے اٹھ کر وہ نلکے کی طرف لپکا۔ کلّی کی۔ منہ پر پانی کے چھپاکے مارے۔ چٹائی پر بیٹھ کر چٹنی اور پیاز کے ساتھ روٹی کھائی، اور ٹھیلہ دھکیلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ریشمی نے ایک خاموش سکون کے ساتھ اسے راستے کی دھوپ میں گم ہوتے دیکھا پھر بکھری کیریوں کی ڈھیری سمیٹ کر امچور کاٹنے بیٹھ گئی۔ ڈھیروں سوکھا ہوا امچور اس کی کوٹھری میں محفوظ تھا۔ جب رسیلے آموں کا موسم ختم ہو جاتا تو ریشمی "امچور" بیچ بیچ کر اپنا گزارہ کرتی۔ جب "آم چور" بھی ختم ہو جاتا تو لال مرچ کوٹتی یا پھر بھاؤ نہ بننے کی صورت میں جنگل سے تیتر بٹیر مور پکڑ پکڑ کر شہر کے بازار میں بیچتی۔

اس کی تمام زندگی کا انحصار محنت پر تھا۔ بیٹے کی ذرا سی کاہلی برداشت نہ کر پاتی اپنے جوان ہٹّے کٹّے بیٹے کے ساتھ سوکھے مارے کالے بابو کو دیکھ دیکھ کر وہ بڑی طرح ترس کھاتی۔

"ارے اب تو بھی گھر بسا اپنا۔ کب تک اکیلی جان جلاتا رہے گا"

"نہیں موسی۔ ابھی نہیں ـــ" کالے بابو کو سلاخوں میں محبوس اپنا باپ یاد آجاتا۔

"تو میری فکر نہ کر موسی"

"کیوں نہ کروں تیری فکر۔ اور کون ہے تیری فکر کرنے والا ـــ"

ریشمی بڑے چاؤ سے گننے لگتی: چاندی کی زنجیر، دو جوڑی ہاتھ کے کڑے۔

دو جوڑی کان کی گنتیاں۔ دو جوڑی پاؤں کے چھلّے دو جوڑی .....،، لیکن کالے بابو اس گنتی کا سارا مزہ کرکرا کر دیتا۔

"مجھے نہیں کرنا ہے گھر ــــ"

"کب تک ٹھوکریں کھائے گا رے۔ تیری ماں تو ڈائن ہے۔ کوئی لڑکی پسند نہ آئے گی اسے، تھو ــــ" ریشمی زمین پر تھوکتی "میری بہن ہوئی تو کیا خراب کو اچھی بول دوں ــــ؟"

"ماں کو کچھ مت بول موسی ــــ،، کالے بابو کی آنکھیں بھر آئیں "ڈائن ہوتی تو بچوں کی منڈیاں مروڑ کر دوسرے کے ساتھ بھاگ نہ جاتی۔ محنت مزدوری کر کے تکلیف اٹھا کے بچوں کو کیوں پالتی۔ جس نے پیدا کیا اسی کے منڈھے نہ مڑھ دیتی!"

کالے بابو کو یکایک گھر کی یاد آجاتی تو چھے کوس کا فاصلہ قدموں تلے پھولوں کی طرح سرک جاتا۔ پھر جب گندے رڑا کو، بہن بھائیوں اور کولہو سے جتی ماں سے دل بھر جاتا تو سر میں خوشبودار تیل ڈالنے، سینما میں وجینتی مالا اور جے شری کا ناچ دیکھنے، ٹھاٹ سے بیڑیاں اڑانے کالے بابو پھر شہر لوٹ آتا۔ کبھی کبھی وہ جیل کی طرف بھی نکل جاتا جہاں کے آہنی حصار کو بے بس نظروں سے گھورتا اور بڑے سے فولادی پھاٹک پر بندوق سنبھالے بیٹھے ہوئے دربان کو دیکھ کر کالے بابو کا جی کرتا کلہاڑے سے یا بکریاں کاٹنے والے تیز ترین چاقو سے دربان کا سر آلو مولی کی طرح چھیل کر رکھ دے لیکن فوراً ہی سلاخیں خود اس کی جانب بڑھتی ہوئی محسوس ہوتیں اور دور چھے کوس پرے سے ماں کی نحیف آواز سنائی دیتی "پہلے مجھے مار ڈال رے۔ پہلے مجھے مار ڈال......" تو کالے بابو کپکپا کر آنکھیں بند کر لیتا، اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ریشمی کے پاس پہنچ کر وِنایک کے بازو میں پڑ رہتا۔ اور سستے تیل کی خوشبو نتھنوں میں اس طرح کھنچنے لگتی جیسے اس کے بازو وِنایک نہیں کوئی ہیروئن لیٹی ہوئی ہو۔

یہ وقت کتنا خوشگوار اور قیمتی ہوتا "نکال بیڑی ــــ،، وہ بڑے تحکم سے کہتا تو وِنایک حیران ہو کر سوچتا۔ کالے بابو کے لہجے میں اتنا تحکم کہاں سے آگیا۔ کہیں زمانے نے اس کے کان میں کوئی ہمت کی بات تو نہیں کہہ دی ــ؟ تب وِنایک کو یقین ہو جاتا سوکھے سینے والا مریل کالے بابو ابھی مر نہیں سکتا کبھی مر نہیں سکتا۔ تب خود بھی بیڑی جلا کر وِنایک کالے بابو سے مزے دار

مزے دار باتیں کرنے لگ جاتا۔ ان کا واحد موضوع "سی نما" ہوتا۔ ہیرو ہیروئن ویمپ اور ولن۔
بڑے بڑے مفکروں اور مبصروں کی طرح دونوں ہر ہر سینما پر رائیں پاس کرتے پھر تھک جاتے
تو گرم گرم روٹیوں کی مہک اپنے اندر اتار کر سر سے پیر تک کمبل تان لیتے۔
ریشمی دارو کے نشے میں بڑی بڑی آوازیں نکالتی یا ماضی کی یاد میں لمبی لمبی تانیں اڑاتی۔
"سنگ لے جا رے گبھرو، سنبھال آبرو۔
وہ سنگ لے جا......"

یہ سن کر کمبل کے اندر ونایک اور کالے بابو کھی کھی ہنستے۔ عورت کا کچھ حصہ ہر عمر میں
جوان رہتا ہے، کبھی بوڑھا نہیں ہوتا جیسے اس وقت ریشمی کا ذہن۔
اور بے سری تانوں کی گونج میں چھم چھم کرتی نیند ان کی آنکھوں میں اتر آتی۔ جب ریشمی
گا گا کر تھک جاتی، اور اسے یقین ہو جاتا کہ ونایک اور کالے بابو سو چکے تو وہ چپکے سے اٹھتی دبے دبے
قدم رکھتی کوٹھری میں پہنچتی اور پھٹے پرانے کپڑوں کی گودڑ میں میلی میلی گندی گرہیں کھولتی پھر
آہستہ آہستہ دیوار کے ایک کونے پر کوئلے سے لکیریں کھینچتی۔ ٹمٹماتے ہوئے دیے کی ہلکی روشنی
میں اس کے ٹوٹے ہوئے بے ترتیب دانت کوندے کی طرح لپکتے۔
اس سال ضرور نفع ہوگا۔ ضرور۔ گہنے تیار ہوں گے۔ گھر میں بہو آجائے گی۔ بہو کے تصور کے
ساتھ ہی کیریوں کی ڈھیریاں۔ بغیر ہاتھ لگائے کے ٹھوس انگور میں تبدیل ہو جائیں۔ پکے پکے آم
خود ہی ٹوکریوں میں بیٹھ کر ٹھیلے پر جا چڑھتے۔ سڑے گلے آم خود بخود گھورے پر جا پڑتے۔
دھوپ میں سوکھی ہوئی لال مرچ اوکھلی میں جا گرتی۔ چوڑیاں بجتیں۔ پسینے کے قطرے ٹپکتے اور
مٹی میں جذب ہونے کی بجائے چاندی بن کر ریشمی کی پھٹی پرانی تھیلی میں جمع ہو جاتے۔
اتنا سارا پیسہ ہاتھ ہلائے بغیر بہو کی محنت سے اسے مل جائے گا اس خیال کے ساتھ ہی
بہو پر دنیا جہان کا پیار امنڈ آتا۔ مضبوط جسم والی شکنتلا آنکھوں میں آجاتی۔ کوئلے کی طرح
کالی فولاد کی طرح سخت۔ خوبصورتی نظر کی چیز ہے اور صرف نظر کی غریبوں کے پاس
کوئی اہمیت نہیں۔

ونایک نے سنا تو صاف منحرف ہو گیا لیکن کالے بابو نے اسے سمجھایا۔۔۔" عورت گوری ہو

یا کالی. خوبصورت ہو یا بدصورت عورت ہی ہوتی ہے اور ہماری اندھیری کوٹھریوں میں وجینتی مالا یا ہیما مالنی نہیں رہ سکتیں، سیتا ساوتری ہی رہ سکتی ہیں!" یہ سن کر ونایک مان گیا۔ کالے بابو کی بات پتھر کی لکیر ہوتی ہے اور نظر کی تسکین کے لیے سینما کا پردہ تو ہے ہی۔ ونایک نے ماں کی ہتھیلی پر ایک دم پچاس روپے دھر دیے۔ ماں ناچ اٹھی۔ پھر کیلوں کے سبز جھنڈ تلے ہرے بھرے منڈپ میں ہلدی سے پیلے پیلے ہاتھوں میں ونایک نے شکن کا سرخ سرخ پونچھ دیا۔ پھر بھر ہاتھ سبز چوڑیاں اور زرد ساڑھی میں شکن کا سیاہ روپ نکھر آیا جیسے کوئلے نے ایک دم آنچ پکڑلی ہو یا کسی چیز کا مول بڑھانے کے لیے اس پر خوبصورت کیس چڑھا دیا گیا ہو۔ ونایک نے شکنتلا کی صورت نہیں دیکھی اس کے جسم پر چمکتے ہوئے اپنے پچاس روپیوں کی چمک دیکھتا رہا تب یکایک ڈھول بجنے لگا ڈھم ڈھم اور پھاوڑوں جیسے چوڑے چپکلے بے ہنگم پاؤں دھرتی کے ملائم سینے پر شبنمی پھوار کی طرح برسنے لگے۔ ڈھول کے بڑے بڑے مرغولوں میں دارو نے تڑپ تڑپ کر ہرنوں کی طرح کلیلیں بھری ــــ

تیری پیاری پیاری صورت کو کسی کی نظر نہ لگے چشم بد دور......

سیاں بھئے کوتوال ہمیں ڈر کاہے کا......

پلّو لٹکے، اجی پلّو لٹکے......

نئے پرانے گیتوں کا خوب قیمہ بنا۔ ونایک نے پہلی بار دارو چکھی تو ساری دھرتی گھوم کر اپنے مرکز سے ہٹ گئی۔

کریپ کے پیلے کرتے اور نقلی سلک کی سرخ تہ بند میں ونایک کا جسم شہنشاہوں کی طرح اکڑنے لگا۔ نقلی ریشم کا سرخ رومال اپنے بالوں پر مرصع تاج کی طرح کس کر ونایک نے اڑان بھری، ور ناچتے ہوئے لوگوں کے دائرے میں آگیا۔

ناچ رے میورا......

زمین آسمان چاند ستارے سب ناچنے لگے اور اس تیز دھمک کی تاب نہ لا کر جب وہ تھما تو اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی لگ چکی تھی۔" دار وغہ جی ــــ؟" ریشمی زخمی ناگن کی طرح لپکی ہوئی آئی ــــ ناچ رک گیا ــــ

"کیا بات ہے صاحب — ؟" کالے بابو نے تھوک نگل کر دریافت کیا —

"معمولی۔ بہت معمولی —" پولس والا ہنسا۔ اس کی کڑوی ہنسی نے ہر طرف زہر گھول دیا۔

"کیا بات ہے بتاتا کیوں نہیں۔ منہ میں پھوڑا پھوٹ گیا ہے کیا؟" ریشمی پھڑ پھڑائی۔

"چپ رہ موسی۔" کالے بابو نے ریشمی کو پرے دھکیل دیا۔ "کیا بات ہے داروغہ جی کچھ بتلایئے تو —"

"تھانے چلو خود ہی پتہ چل جائے گا" "پھر بھی کچھ معلوم تو ہو" "اسی سے پوچھو نا"

"کالے بابو نے آہستہ سے ونایک کے کندھے پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھا۔" کیا ہوا۔ ؟"

"ہاں، میں نے بھورے کا خون کر دیا ہے" ونایک بولا "اس نے کہا تھا شکنتلا صاف نہیں میلی ہے ......"

کالے بابو چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔

"جھوٹ۔ بالکل جھوٹ —" ریشمی لوگوں کی گرفت سے آزاد ہو کر چلائی۔

"ہی ہی ہی —" پولس والے نے دانت نکوسے۔ "تو نے ایسا کیوں کیا۔ کیوں کیا بول، بول بے" ریشمی نے ونایک کی کمر پر دو ہتڑ جمائے۔ "اب بولنے کو رہا کیا — خونی کہیں کا۔ چل چل" پولس والے نے ہتھکڑی والی زنجیر کو جھٹکا دیا۔

ریشمی نے آگے بڑھ کر پولس والے کی کلائی میں اپنے دانت گاڑ دیے۔ لوگوں نے بمشکل ریشمی کو الگ کیا۔ پولس والے نے اسی زخمی کلائی سے کس کر ایک جھانپڑ ریشمی کے گال پر رسید کیا۔

"خونی بیٹے کو جن کر اتنا دعویٰ۔ پیروں میں بیڑیاں ڈال کر بیٹھایا کیوں نہیں گھر میں۔" وہ بے دردی سے ونایک کو کھینچتا ہوا لے چلا۔ کالے بابو اپنی جگہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا ......

ریشمی چکرا کر زمین پر گر پڑی۔

ڈھول کے مرغولے میں ونایک اپنے تنومند جسم کے ساتھ کٹے ہوئے پیڑ کی طرح کھنچا چلا گیا۔ اس کی رندھی ہوئی مگر واضح آواز صاف سنائی دیتی رہی۔ "پروا مت کرنا شکن میں جیل کاٹ کر آؤں گا پھر تو اور میں مل کر دارو پییں گے۔ ڈھول کے گت پر ناچیں گے، گائیں گے۔ ہاں

میرے پیچھے میری ماں کا خیال رکھنا اسے تکلیف نہ ہونے دینا.....''

ونایک کی دور ہوتی ہوئی شکل ریشمی کی چکراتی ہوئی آنکھوں میں غائب ہو گئی اور دنیا بھر کی لال مرچیں بوروں سے اڑ اڑ کر ریشمی کی آنکھوں میں بھر گئیں۔ میری میا، میری میا وہ جلن کی تاب نہ لا کر اپنا سینہ کوٹنے لگی اور آگ پکڑا ہوا شعلہ دفعتاً بجھ کر راکھ ہو گیا، شیشے کا نازک کیس چھناکے سے ٹوٹ گیا جس کی ساری کرچیں شکن کے توانا جسم میں کھچا کھچ چبھ گئیں۔ ونایک کے سر سے گرا ہوا نقلی ریشم کا سرخ رومال دھول میں اٹا پڑا تھا شکن نے لپک کر اسے اٹھا لیا اور اپنے سینے سے بھینچ بھینچ کر رونے لگی۔

یہ کیا ہو گیا.....

میری میا......

میری میا.....

وہ گھسٹ رہا تھا۔ رینگ رہا تھا۔

اس کا بدن اس کی قوّتِ ارادی کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

بے پروا لوگ اس کے اطراف سے ہمیشہ کی طرح بے نیاز بیگانہ گذر رہے تھے۔ کوئی بھی رک کر اس کی طرف متوجہ ہونے کو تیار نہیں تھا۔ انسانوں کی اس بے رخی سے اپنے سارے آنسو مدّت ہوئی اس نے خود ہی پی لیے تھے لہٰذا اب اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ درد کا ایک قطرہ بھی اس کی آنکھوں میں نہیں تھا۔ درد کی جگہ اب چہرے پر سفّاکی تھی جیسے اگر اس کا بس چل جائے تو اپنے اردگرد کے تمام انسانوں کو جو ہمہ وقت انسانیت کا مذاق اڑاتے رہتے تھے، ایک دوسرے کو دھوکا دیتے رہتے تھے وہ پل بھر میں بھون ڈالے مگر نہ اس کا بس پہلے کبھی چلا تھا نہ اب چل سکتا تھا اس لیے وہ اکیلا ہی گھسٹ رہا تھا، رینگ رہا تھا جب کہ اس کے آزو بازو دنیا برق رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔

اسی بے پناہ ہجوم میں ایک خوش و خرّم خاندان اس کے قریب سے گذرا تو ننھے کے ہاتھ میں تھمی ہوئی گیند اچانک پھسل کر اس کے گھسٹتے ہوئے گھٹنے سے آ لگی۔ ننھے نے منٹ بھر کے لیے ٹھٹھک کر اپنی گیند کو دیکھا پھر ماں کا ہاتھ چھڑا کر گیند کی طرف لپکا۔ جھک کر پہلے ننھے نے اپنی گیند اٹھالی پھر بطورِ شکریہ جھک کر اس کی میلی پیشانی پر بوسہ دیا، جیسے کہنا چاہتا ہو تھینک یو انکل۔

یہ دیکھ کر ننھے کی ماں چلائی۔

"چھی چھی چھی۔ یہ کیا کیا تم نے منّے۔ گندے بھکاریوں کے قریب نہیں جاتے۔ بیٹا تم نے تو اپنا آپ بھی غلیظ کر لیا۔ توبہ توبہ —"

مگر ننھے کو چونکہ انسانوں کا فرق معلوم نہیں تھا نہ وہ بھکاری کو جانتا تھا نہ قائل کو۔ اس کا رویہ سب سے یکساں تھا۔ اپنے والدین، ارکان خاندان اور دوستوں جیسا۔ لہٰذا ماں کی گھُڑکی سن کر بھی منّا مسکراتا اور اپنی منی منی آنکھوں سے یک ٹک اسے دیکھتا رہا جس کا خوشی سے اور منّے کے غیر متوقع التفات سے برا حال تھا۔ اگرچہ کہ بھکاری کے غصّے نے اس میں آتش نمرود بھڑکا دی تھی لیکن ننھے کا بے لوث بوسہ ساون کی خوشگوار خوش آئند رُت کی طرح اس میں پھیل کر زندگی بھر کے پت جھڑ کو فراموش کروا گیا تھا، اور اس وقت وہ سرتاپا اس ساون کے لطف میں گم تھا۔

اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ اسے چوم کے اسے ایک ٹک دیکھ کے وہ معصوم فرشتہ کب وہاں سے رخصت ہوگیا۔ کافی دیر بعد جب وہ ساون کے غیر متوقع انبساط سے چونکا تو یک بھیانک خلا اس کے آگے اپنا مہیب دہانہ پسارے ہوئے تھا۔ اس خلا میں گھاٹیاں ہی گھاٹیاں تھیں نشیب ہی نشیب۔ کہیں بھی کوئی بلندی کوئی فراز نہیں تھا۔

فرتوس کی زندگی میں اس وقت تھا جب اس سے پہلی غلطی سرزد نہیں ہوئی تھی اور بلند مرتبہ زندگی کے اعلیٰ مقام پر ٹھہرا وہ دنیا کو پسندیدگی سے دیکھ رہا تھا کہ اپنے جیسے انسانوں نے ہی سبز باغ دکھا کر اسے اپنے پھندے میں پھانس لیا۔ اس اسیری کے بعد تمام سبز باغ اس کی نظر سے اوجھل ہوگئے۔ سارے فراز اس کی زندگی سے گم ہوگئے۔ وہ یک بار پھسلا تو زبردستی بار بار پھسلایا گیا یوں پستیاں ہی پستیاں اس کی زندگی بن گئیں کیونکہ لاعلمی اور ناتجربہ کاری سے وہ اپنے جن دوستوں کے ہاتھوں گرفتارِ بلا ہوا تھا وہ بلا تامل سیدھا اسے زندگی کے تہہ خانے میں لے گئے تھے جہاں بے اندازہ حبس تھا اور زبردست گھٹن۔ جہاں انسانوں کا ایک جمِ غفیر تھا مگر خود سے انجان و بیگانہ ان ہی دوسروں کی طرف دیکھتا ہوا جنھوں نے انھیں تہہ خانوں میں پہنچایا تھا۔

اس بات کو سمجھ کر اس نے وہاں سے بھاگ لینے کی ازحد کوشش کی لیکن کامیاب

نہ ہو سکا اور تب سے اب تک۔

تندرستی اور صحت سے اپنے خرابے اور خستہ حالی بربادی تک۔ توازن سے اپنے عدم توازن تک بربادیوں کا ایک لمبا سلسلہ تھا جو ہنوز جاری تھا۔ نہ معلوم کب تک ساتھ ساتھ گھسٹنے والا، کہ اچانک ایک معصوم وجود نے اسے چوم کر اس کی خشک آنکھیں دوبارہ تر کر دیں، اچانک امنڈ آنے والے اپنے بے پناہ آنسو پونچھ کر اردگرد کی رونقوں سے بے پرواہ وہ بے ساختہ چلّایا: "اپنی ماں کا ساتھ کبھی نہ چھوڑنا تھے۔ اپنے گھر کو کبھی نہ بھولنا، اپنی دولت کو یاد رکھنا۔"

گذرتے ہوئے لوگ ٹھٹک کر اسے دیکھنے اور تمسخرانہ ہنسنے لگے۔

"پاگل خانے سے چھوٹا ہوا معلوم ہوتا ہے یا شاید اپاہج گھر سے باہر نکل آیا ہے اسے ہٹاؤ یہاں سے۔"

"دور لے جاؤ شہزادے ورنہ اس کی گندگی دوسروں کو بھی آلودہ کر کے رہے گی۔"

"ونہہ۔ جانے غلاظت کو سڑکوں پر پڑے رہ جانے کی اجازت کس طرح دے دی جاتی ہے۔"

یہ ہنستی ہوئی کئی آوازیں اس کی گم گشتہ یادداشت میں ابھر ابھر کر ڈوب رہی تھیں جواب میں اس نے کہنا چاہا ہرگز نہیں، میں گندہ غلیظ نہیں ہوں۔ میرا ظاہر میلا مگر باطن صاف ہے۔ خدا کے واسطے میرے باطن کو دیکھو، میرے ظاہر کو مت دیکھو، مگر بہت سے لوگوں کی شکایت پر چند لوگ بے دردی سے اسے کھینچتے ہوئے لے گئے اور واقعی اپاہج گھر پہنچا دئے کسی نے اس کے احتجاج کی پروا نہ کی۔

اب وہ قیدی بھی تھا۔ دوسروں کا۔

اپنی غلطی کی پاداش میں اب تک خود کا اسیر رہا تھا مگر اب؟

شرم و ذلت سے اس کا وجود کانپ گیا۔

کیا وہ اسی لیے پیدا ہوا تھا؟

کرب کی ایک تیز لہر جوار بھاٹے کی طرح بھری لیکن آنسوؤں کی نمی بن کر اس کے کرب کو دور نہ کر سکی۔

اب پھر اس کی آنکھیں بے حس تھیں، خشک تھیں اپنی ذلت کے سوائے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔
اس نے گھٹی گھٹی دبی دبی آوازیں دیں۔
"ننھے، ایک بار پھر اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کا اپنے شاداب ہونٹوں کا لمس مجھے بخش دو شاید اس طرح میں اپنی کھوئی ہوئی طاقت اکٹھا کرسکوں، بہیمیت و درندگی سے لڑ سکوں منے ـــ منے......" مگر دور و نزدیک کوئی نہیں تھا۔ اس کا اپنا سناٹا اس پر خندہ زن تھا اور اپنے بے کیف اشغال میں مصروف معذور انسانوں کی حالت زار پر فضا کی کراہیں اسے علانیہ سنائی دے رہی تھیں۔
ذہن پر زور ڈال کر اس نے اپنا نام یاد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن نام تو مدت ہوئی اس وقت جب نشیب اس کی قسمت بنا دیا گیا اس نے خود کھرچ کر خود سے الگ کر دیا تھا اس کے بعد سے تو اس کا کوئی نام ہی نہیں رہا تھا۔
اپنا نام یاد کرنے کی احمقانہ کوشش پر وہ محض مسکرا دیا۔
یہ مسکراہٹ بھی کتنے عرصے بعد اس کے احساس کے ہونٹوں پر ابھر سکی تھی۔
بے وقوف۔ بے معنی سی مسکراہٹ، ناآسودگی اور احساسِ طمانیت میں کتنا تھوڑا فاصلہ ہوتا ہے ـــ؟
صرف ایک غلطی جو پھر انسان کو سدھرنے کا موقع کبھی نہیں دیتی کتنی آسانی سے سرزد ہو جاتی ہے۔
غلطی پر سینے ٹھوکر لگانے والے تو سب ہیں
غلطی کو سدھانے سنبھالنے والا کوئی نہیں۔
اپنی ماں کی درد بھری سسکیاں اس کے کانوں میں گونج کر اسے مزید بے حال کر گئیں۔
ماں نے کتنا سمجھایا تھا۔ کتابوں کو اپنا سب سے اچھا دوست سمجھو مگر اس نے سب پر بھروسہ کر لیا۔ انھیں ہمیشہ خود سے زیادہ سمجھا۔
خود دھوپ سہہ کر پیڑ تو تھکے ہوؤں کو چھاؤں دیتے ہیں مگر انسان۔؟
انسان انسان کو سائبان فراہم کرنے میں کس قدر تنگ دل ہوتا ہے۔

چند لمحے وہ یہی کچھ سوچتا رہا پھر یکایک اسے یقینی احساس ہوا کہ اب اس میں کچھ نہیں بچا۔ وہ سڑ چکا ہے۔ واقعی متعفن ہے۔ اس جانکاہ یقین سے قبل انسان ہونے کا جو تھوڑا بہت غرور اس میں باقی تھا وہ اب یکلخت سراسر پگھلا گیا۔ ختم ہو گیا۔

ایک ڈر، ایک خوف، ایک اندیشہ......

اگر پھر کبھی گھٹتے وقت وہ ننھا منا فرشتہ سمجھ دار انسان بن کر اسے مل گیا اسے پہچان کر اس کی پیشانی پر ثبت اپنے بوسے پر شرمندہ ہو گیا تو۔؟

پوری شدت سے وہ پشیمانی کی تاریکی میں دھنستا چلا گیا۔

نہیں نہیں ــــ نہیں ـــ

یہی ایک لطیف احساس تو اس کا اپنا بن کر اس کی اکھڑی ہوئی سانسیں ٹھیک کر سکا ہے اسے اپنا سکا ہے تو پھر وہ کس طرح اس دوست کو خود سے چھن جانے دے۔

پہلی بار اسے خود اپنی سڑاند محسوس ہوئی اور خود کا یہ ادراک ہی اس کی موت تھی۔ اپنے گرد بنے گئے تمام جال توڑ پھینکنے اور اپنی وحشی برادری سے بدلہ لینے کا اس کا تمام عـزم پانی پانی ہو گیا۔

بے بسی نے رفتہ رفتہ اسے چبانا کھانا شروع کیا اور پھر ایک روز

کئی دنوں بعد ایک روز آخر کار اس کی پاکیزہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر ہی گئی۔ باقی رہ گیا اس کا متعفن جسم جو قوت کے خاتمے کے ساتھ تیزی سے گلنے لگا۔

لوگوں نے حیرت سے دیکھا کہ وہ پورے کا پورا مواد کی طرح بہہ گیا۔

صرف اس کی پیشانی زندہ و تابندہ باقی رہ گئی، سورج کی طرح جگمگاتی ہوئی۔

خوشبو کی منزل

جس ٹہنی پر پھول کھلا تھا وہ اس کے قد سے بہت اونچی تھی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اس کا ہاتھ پھول تک پہنچ جائے لیکن نہیں پہنچا۔

ابا نے دھندلی آنکھوں میں چمک بھر کر اس کی ہمت بڑھائی "ہاں ہاں توڑ لو بیٹی کسی طرح توڑ لو۔"

اماں نے پھٹکارا "یہ پھول توڑنے کے لیے اپنے ہاتھ پیر نہ توڑ بیٹھنا نیک بخت! نہیں تو کوئی بیاہ کے بھی نہیں لے جائے گا۔"

صابو نے "آپا لکڑی مار دو پھول نیچے آ رہے گا" لیکن سطوت کو ٹوٹے ہوئے پھول پسند نہیں تھے۔ وہ زمین پر گرے ہوئے پھولوں کی مرجھائی ہوئی پنکھڑیاں چن چن کر کچرے کے کنستر میں پھینکتی رہی۔

صابو کی ڈھیر بھر سہیلیاں ہر چھٹی کے دن بلا ناغہ گھر آن دھمکتیں، آپا کے دوست بھی آیا کرتے لیکن سطوت کا کوئی دوست نہ تھا۔ جستجو اس کی زندگی کا مقصد

سطوت کو یہ بات جہاں آپا نے سکھائی تھی: ہمت فتح کا پہلا زینہ ہے اور زندگی بغیر کامیابی کے بیکار، بے فائدہ۔

جہاں آپا سطوت کو اس لیے بھی عزیز ہو گئی تھیں کہ ابا کی موت کے بعد وہی اس کی ہمت افزائی کرنے والی واحد ہستی تھیں جبکہ بیوگی کی خلافِ توقع چوٹ نے اماں کی کمر دو

صبا کی ہمتیں ایسی توڑ دی تھیں کہ وہ دونوں ہی ہر وقت واویلا کرتی رہتیں جبکہ سطوت سوچتی ہر ہر الم ہر ہر قدم پر شکست کھا جانے اور ذہنی مات کا ماتم کرتے رہنے والے اصل میں بزدل ہوتے ہیں اور بزدل کبھی زندگی کی بازی نہیں جیت سکتے۔ ادھر اماں کے بہی خواہ سطوت اور صبا کو دیکھ دیکھ کر دانتوں تلے انگلی دباتے۔

"ہائے بے بن باپ کی بچیاں، کیا ہوگا اب ان کا" تو اماں اور ہولا جاتیں اور صبا سسک پڑتی لیکن سطوت کو غصہ آجاتا۔ اپنے سمندر کی طرح منڈتے جسم سے اور جذبات سے بے پرواہ اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ ماں اور صبا کے لیے۔ اس لیے ابا کی ناگاہ وفات کے بعد وہ اس موقع پر اڑ گئی جب اماں نے سے پڑھائی جاری رکھنے سے منع کیا۔

"اسکول کی پڑھائی ختم ہو چکی ہے۔ اب کالج والج نہ جانا، سنا ہے لڑکیاں وہاں بگڑ جاتی ہیں" اماں سے یہ سن کر وہ مارے طیش کے آپے سے باہر ہو گئی "کون کہتا ہے یہ بے سر و پا باتیں آپ سے؟ میں تو ضرور جاؤں گی ضرور جاؤں گی، اپنی پڑھائی ہرگز ختم نہیں کروں گی۔"

اس نے اماں سے اس طرح کہا جیسے کسی حقیر ہستی سے مخاطب ہو اور اماں اس کے اب و لہجے اور عزم سے لرزاں ہو گئیں جیسے اس کی بات ماننے پر مجبور ہو گئی ہوں اپنی مرضی کے بالکل ہی خلاف۔

اور سخت کشمکش کے بعد کالج میں داخلہ ملتے ہی سطوت خود کو دنیا کی بلند ترین ہستی سمجھنے لگی اور جب جہاں آپا نے اس کی پیٹھ ٹھونک کر اس کے حوصلے کی داد دی "شاباش تم ضرور لائق ہو گی" تو اس کی پوری ہستی گلستاں میں تبدیل ہو گئی۔ سہانے سپنے خوابوں سے اس کی آنکھیں سج گئیں۔

پھر چھ مہینے ہوا کے جھونکے کی طرح گذر گئے۔

سطوت کے چہرے پر شباب کی رعنائی تو ضرور تھی لیکن اس کے طور طریق، اور رکھ رکھاؤ میں سنجیدگی اور بردباری۔ اس کے تمام برتاؤ میں مستقل مزاجی کا جلال۔

جب وہ کالج جانے کے لیے باہر نکلتی تو گلی کے ونڈے پاڈے اسے دیکھ دیکھ کر مسکراتے فحش فقرے کستے۔ گندے گھٹیا کانوں سے اس کا راستہ روکنا چاہتے۔ سطوت نے مدت تک ان پر رحم کھا کر انھیں نظر انداز کیا مگر جب ان کی سرگرمیاں بڑھنے لگیں تو ایک روز پاؤں کی نوکیلی جوتی سے ایک دو کی ایسی مرمت کی کہ دوسرے سارے سطوت کی اس جرأت پر فوراً اڑن چھو ہو گئے اور

سارے محلے میں سطوت کی دھاک بیٹھ گئی پھر کسی منچلے کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ کالج آتی جاتی سطوت کو چھیڑ لیتا۔ صرف اماں ہولاتی رہیں "میری بات مان لے سطوت۔ اس طرح تن تنہا آنا جانا اچھا نہیں غنڈوں سے کون ٹکرا سکتا ہے بھلا"۔ لیکن سطوت نے ماں کے کہے کی کبھی پروا نہ کی۔ اسے اس دن کا بیحد انتظار تھا جب ماں فائق بن کر وہ خود پہ ترس کھانے والوں کے منہ پر تھوک تھوک دے گی اور پھر مٹھیوں روپے لڑکوں کی طرح اماں کی ہتھیلی پر لا دھرے گی تو اماں بھی کیا یاد کریں گی کہ انھوں نے بیٹی کے جنم میں بیٹے کو پروان چڑھایا ہے۔

جہاں آپا سچ کہتی ہیں کہ مایوسیوں کو محسوس کرو تو وہ پہاڑ بن جاتی ہیں اور مایوسیوں کی پروا نہ کرو تو وہ تنکے جیسی بے حقیقت ہو جاتی ہیں۔

سطوت حد سے زیادہ مسرور تھی مطمئن با ہمت مگر وہ عجیب سہ پہر تھی جب بادل بھنور کی طرح عمیق اور رت کی طرح گھٹا ٹوپ برسنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ برسات کے آثار بے حد شدید اس لیے سطوت وقت سے پہلے ہی کالج سے نکل کھڑی ہوئی۔ برسات کے شروع ہونے سے پہلے ہی وہ گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ تیز تیز قدم اٹھاتی جب وہ کالج کے پھاٹک سے نکلی اور مختصر ترین راستہ اپنانے کی خاطر پختہ سڑک چھوڑ کر قریبی گلی میں مڑی تو چند قدم بڑھتے ہی ٹھٹھک کر رک گئی۔ ایک جیپ جس میں چار پانچ آدمی ٹھنسے ہوئے تھے زناٹے سے آتے آتے یکلخت رک گئی۔ سطوت جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو...... بدبداتی ایک طرف کو سمٹ گئی۔ جیپ ڈرائیو کرنے والے نے جیپ کو ریورس کیا اور ٹھیک اس کے قریب لا کر روک دیا۔

"برسات آنے والی ہے، آپ کو آپ کے گھر پہنچا دیں"۔ سوال کیا گیا۔

"جی نہیں شکریہ! میں چلی جاؤں گی"۔

"بھیگ جائیں گی، کیا فائدہ"۔

سطوت اور بھی تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

"بیمار ہو جائیں گی، کیا حاصل"۔ جیپ اس کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی۔

"پلیز!" سطوت گڑگڑائی۔ ٹھیک اسی وقت اسے جیپ کے اندر کھینچ لیا گیا اور

اتنی سختی سے اس کا منہ بھینچا گیا کہ وہ مارے تکلیف کے اُف بھی نہ کر سکی۔ خود کو آزاد کرانے کے لیے سطوت نے بہت ہاتھ پاؤں پٹکے مگر گرفت اتنی مضبوط تھی کہ آخرکار سطوت کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور وہ خود سے بھی غافل ہو گئی۔ جب ہوش میں آئی تو ایک کمرے میں بند تھی سطوت نے دیوانہ وار دروازے پیٹے۔ دیوانوں کی طرح چلا چلا کر آوازیں دیں۔ رحم کی درخواستیں کیں لیکن سب بے سود، کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی، کوئی اس کی مدد کو نہ آیا۔ زندگی میں پہلی بار اپنی تمامتر ہمت کے باوجود سطوت کو ایسے خطرے کا احساس ہو جس میں اس کی تدبیریں اور کامیابی مشکوک تھی۔ دروازوں کے بعد اس نے کمرے کی دونوں کھڑکیوں اور دونوں روشن دانوں کو بغور دیکھا مگر سب کے سب سختی سے بند تھے جیسے ان پر پہلے سے ہی میخیں جڑی ہوئی ہوں۔ تو۔ ؟

بادل گرجتے رہے۔ آسمان کی آنکھیں بھیگتی رہیں۔ زمین کا سینہ نم ہوتا رہا۔ تاریکی لمحہ لمحہ بڑھتی رہی کہ دھڑ سے دروازہ کھلا اور شراب کی تیز بدبو سطوت کے نتھنوں میں گھسی چند مکروہ شکل لوگ اندر داخل ہوئے تو ان کی پیٹھ کے پیچھے دروازہ پھر بند ہو گیا۔ رحم، رحم۔ سطوت گڑگڑاتی رہی مگر کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔ چند وحشی آوارہ قہقہے بلند ہوئے اور سطوت کی بے بسی کا مذاق اڑانے لگے۔ پروردگار، پروردگار..... وہ اپنی پوری شدت سے چلانا چاہتی تھی کہ بے بس ہو گئی اور پھر......

اگلی صبح پھٹتی ہوئی پو میں جب وہ دوبارہ اسی گلی میں لاکر پھینکی گئی تو اس کی ہیئت اتنی بگڑ چکی تھی کہ وہ خود اپنے آپ کو پہچانتے ہوئے بھی لرزنے خوف کھانے لگی۔

اس کی بازیافت پر اماں نے پہلے تو اپنی گیلی آنکھیں خشک کر کے اسے اپنی چھاتی سے لگایا پھر سطوت کی شکل اور اجڑی ہوئی حالت بھانپ کے انھوں نے دو تھپڑ اس کی پیٹھ پر رسید کیے اور پلو آنکھوں پر رکھ کر بے تحاشہ سسک پڑیں۔

"میں نہ کہتی تھی اس طرح مت آجا نہیں مانا تو اب جا وہیں مر۔" اور گزری ہوئی بے رحمیوں اور بے دردیوں کو یاد کر کے سطوت ایک بار بڑی زور سے کانپی پھر ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح اماں کی باہوں میں گر پڑی۔ ذہنی صدمے سے سنبھلنے میں اسے دنوں لگ گئے

اور بعد میں اس نے عقل و فہم سے بار بار پوچھا۔ یہ سب کیوں ہوا۔ کس لیے۔ مگر اسے کوئی جواب نہ ملا
جان پہچان والوں نے اماں کو صلاح دی دی میں اس کا رشتہ طے کر دو کلنک اسی طرح مٹ سکتی
ہے مگر ہاتھوں سے منہ ڈھانک کر لرز لرز کر سطوت نے اماں سے کہا۔

"نہیں نہیں، نہیں اماں، اس سے تو بہتر ہے مجھے ذبح کر دو، کنویں میں پھینک دو" وہ
اور اماں روتے رہے، صبا حیران ہوتی رہی، لوگ انگلیاں اٹھاتے رہے۔

کچھ لوگوں نے تسلیاں دیں۔ کچھ لوگوں نے طعنے دیے۔ کچھ نے رسم و راہ ترک کر دی۔ کچھ نے
از راہ ہمدردی مشورہ دیا کسی اور جگہ منتقل ہو جاؤ جہاں تم دنیا کے لیے اجنبی اور دنیا تمھارے
لیے نئی ہو۔ کوئی جاننے پہچاننے والا نہ ہو۔ تب وہ بادل نخواستہ نئے محلے میں اٹھ گئے
سطوت پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلاؤں میں گھورتی رہتی۔ اماں مشین کی ہتھی پر انگلیاں
جمائے آنسو ٹپکاتی رہتیں۔

مینا کی طرح چہکنے والی۔ مورنی کی طرح تھرکنے والی کوئل کی طرح کوکنے اور ہرنی کی طرح
کلیلیں بھرنے والی سطوت کو بے حس گم صم خاموش دیکھ کر اپنی ساری خفگی کے باوجود اماں
بوکھلا جاتیں۔

"کچھ کام کرو، کچھ بولا کرو۔ یوں بت بنی کب تک زندگی گزار سکو گی؟" مگر زندگی
کے لیے سطوت کا رویہ ایک دم تبدیل ہو گیا۔ وہ ہر وقت کوتوں کھدروں میں دبکی آنے جانے
والوں سے روپوش اماں کی ہمت افزائیوں، سے بے نیاز ایک ہی دعا مانگا کرتی۔ خدا کرے
دنیا کے سارے مرد تہس نہس ہو جائیں ایک بھی منہ دکھانے کو باقی نہ بچے۔

ایسے میں ایک روز ڈھونڈ ڈھانڈ کے جہاں آپا اس کے گھر پہنچ گئیں۔ سطوت نے
دوڑ کر آنسوؤں کا مینھ برساتی آنکھوں کے ساتھ انھیں تھام لیا۔ "جو ہمت کر کے بھی
ہار جائے اس کا دنیا میں کیا مقام ہوتا ہے جہاں آپا ــــ؟"

جہاں آپا نے اس کے طرز تخاطب پر حیرت اور ہمدردی سے اسے دیکھا پھر اماں سے
اجازت لے کر سطوت کو اپنے ساتھ لے گئیں۔

جب جہاں آپا نے سارا قصہ سنا تو پھر اس کی پیٹھ ٹھونک کر بولیں۔

"پروا نہ کرو میں تمھارے ساتھ ہوں!" جہاں آپا نے مرے سطوت کو کالج میں بٹھلایا اور اپنے ساتھ اپنی موٹر میں اسے لاتی لے جاتی رہیں۔

پھر جس دن سطوت نے سارے امتحان پاس کر لیے اور زندگی کو جیتنے کے قابل ہو گئی اس روز جہاں آپا اچانک سسک پڑیں۔ اسی دن سطوت کو معلوم ہوا خود جہاں آپا مردوں کے مکر کا شکار رہیں۔ جہاں آپا نے اپنے ہاتھ سے ایک ننھی سی جان کا گلا گھونٹا ہے۔ ایک خوشحال بے فکر زندگی سے کنارا کیا ہے۔ زیست کی خوشبو کو اپنے اندر دفنا دیا ہے پھر بھی وہ مایوس نہیں۔ وہ اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکیں جب تک عورتیں یہ حقیقت نہ سمجھ لیں کہ انھیں حادثات کا مقابلہ کرنا ہے۔ سانحوں سے ڈر نے ہار ماننے کے بجائے اپنی ثابت قدمی سے اپنے اٹل ارادوں سے خود انھیں شکست دینی ہے۔

اس کربناک حقیقت کو جاننے کے بعد سطوت کے دماغ میں جس خیال نے سب سے پہلے اپنی جگہ بنائی وہ بے حد اٹل مستحکم ارادہ تھا جس کی تکمیل کے لیے سطوت بڑی شد و مد اور نئے جوش و خروش کے ساتھ ایک نئی بنیاد ڈالنے آگے بڑھی۔

طالب علم سے ٹیچر بن کر وہ لڑکیوں کے ایک غول کو بالکل جہاں آپا کی طرح سکھا رہی تھی۔ ہمت — ہمت — ہمت —!!! حادثات راستے کے وہ پتھر ہیں جن سے غافل رہو تو زخمی کر دیتے ہیں ورنہ خود ایک زبردست ٹھوکر کے محتاج۔ اماں چیخ چیخ کر رہ گئیں۔

"پاگل پن چھوڑ سطوت! کسی نہ کسی طرح اپنا گھر بسا لے اور صبا کا بھی کوئی انتظام کر۔"
لیکن سطوت کو تو ہر اس سوال ہر اس بات سے نفرت ہو گئی تھی جس سے مرد کا ذرا سا بھی تصور وابستہ ہو۔ صبا کی البتہ وہ فانوس کی طرح حفاظت کرنا چاہتی تھی تاکہ خود جو کچھ اس کے اپنے ساتھ پیش آیا صبا کو اس کی ہوا بھی نہ لگنے پائے دنیا اسے کوئی روگ نہ لگا پائے۔

اور جہاں آپا کی کنپٹیوں پر بڑھنے والا ایک ایک سفید بال سطوت کو ان بے حساب بے شمار لڑکیوں کی طرح نظر آتا جو زندگی کے گرداب میں بلا وجہ پھنس کر ہمیشہ کیلئے ڈوب گئیں

دم توڑ گئیں تب وہ دوبارہ نئے سرے سے دوسری طرف جہاں آپا کے ایک ایک سفید بال کا زمانے بھر سے انتقام لے گی کہ اچانک اس کی سکوت بھری زندگی میں پھر ایک دھماکہ ہوا۔ سطوت کو یقین ہی نہ آیا کہ صبا، اس کی جان سے پیاری لاڈلی صبا، کینیڈا سے چند مہینوں کے لیے آئے ہوئے پڑوسی کے ساتھ علم و اطلاع اور اجازت کے بغیر پوری رازداری سے چلی جائے گی۔

سطوت کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ وہ یہی سوچتی رہی کیا وقت ہمیشہ خود کو دہراتا رہے گا۔ جو لوگ بُرے وقت کو فراموش کرنے اور اس پر غلبہ پانے کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں وہ ہاتھ پاؤں مارتے بھٹکتے ہی رہیں گے۔ اسے زبردستی مزاحمت کے باوجود لے جایا گیا تھا مگر صبا خود اپنی مرضی سے اسے چھوڑ کر، اسے بھول کر نظرانداز کر کے خوشی خوشی کس طرح چلی گئی؟ اس خیال کی وزنی درد بھری سِل لمحہ لمحہ سطوت کو کچلتی دلتی رہیں۔ زندگی کا رہا سہا اطمینان کہ صبا پڑھ لکھ کر دلہن بنے گی، اپنا گھر بسائے گی، عزت کی زندگی گذارے گی، حد سے زیادہ اضطراب کی نذر ہو گیا۔ سطوت بکھر بکھر گئی۔

اور صدیوں جیسے ایک طویل سال کے بعد جب صبا سطوت سے ملنے واپس آئی تو اس کی گود میں ایک وجود اور تھا۔ سطوت بے حد کوشش بے حد خفگی کے باوجود اپنے تمام رنج و الم کے باوجود اس ننھے وجود کو نظرانداز نہ کر سکی۔ اس نے خود پر بہت جبر کیا، صبا سے اپنی ناراضگی برابر بنائے رکھی لیکن اس کے اندر دبی ہوئی عورت ایکا ایکی سینہ تان کر کھڑی ہو گئی اور سطوت نے سب کچھ بھول کر تمام کڑوے ماضی کو فراموش کر کے صبا کی آغوش میں کلکاریاں مارتے نوزائیدہ وجود کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور اس طرح کرتے ہوئے اس کی نظر میں صبا کا وجود یکایک جہاں آپا کے وجود میں تحلیل ہو گیا۔

جہاں آپا جو فاتح تھیں لیکن دنیا کی سمت اب تک دونوں ہاتھ پھیلائے زندگی کی کھوئی ہوئی خوشبو کو دوبارہ پا لینے کے لیے بے قرار تھیں۔ شاگردیوں کی کھیپ کی کھیپ جہاں آپا کی کنپٹیوں پر سفید بالوں کا اضافہ کرتی جا رہی تھی مگر روٹھی ہوئی خوشبو نے ان کی طرف پیش رفت نہیں کی تھی۔

سطوت نے بے اختیار اپنے بدن میں ایک گرم جو لہر سی محسوس کی۔ اس دن چاند نے مدت بعد سطوت سے کہا: "میں حسن ہوں"، "عقل ہوں"، "میں مہک"

شباب نے یاد دلایا "میں ہوا کا ایک لطیف جھونکا ——"

اور حیات نے یاد دلایا —— "دنیا ایک بڑا الاؤ ہے جو خود کو زندہ اور روشن رکھنے کے لیے ہمیشہ کم ہمتوں اور بے وقوفوں کا ایندھن مانگا کرتا ہے!"

آرزو نے کہا —— "میں ایک چشمہ، زندگی کی شادابیوں کو سیراب کرنے والا ——"

اور عمر نے کہا "میں ایک خزانہ خرچ ہو کر دوبارہ کبھی نہ ملنے والا!" اور گزرے ہوئے شب و روز نے جتلایا "مایوسی ایک گڑھا ناامیدی ایک اژدہا اور جدوجہد خود حفاظتی کے مدافعتی ہتھیار!"

نہ جانے کس نے کہا "دنیا ایک بڑا جال ہے اور سارے انسان پکھیرو جن کے پر کٹ جائیں تو لا محدود فضاؤں کو کبھی تسخیر نہ کر پائیں، مگر ہستی ایک میدانِ کارزار جہاں عمل اور فکر میں ہمیشہ جنگ جاری۔ جنگ جو تباہی لاتی ہے ساتھ ساتھ تعمیر کا ولولہ بھی۔ جب طوفان آتا ہے تو یہ نہیں سوچتا کہ اس کی زد میں کتنی زندگیاں نیست و نابود ہو جائیں گی کتنے گھر تباہ و تاراج...... وہ تو بس آتا اور گزر جاتا ہے لیکن انسان

ٹوٹا پھوٹا شکستہ خستہ حال انسان ساری تباہ کاریاں بربادی بھلا کر پھر تشکیل نو میں ہمہ تن ہمہ ذہن مصروف ہو جاتا ہے، یہی انسان کی افضلیت ہے۔

اتنی وسیع، اتنی گوناگوں دنیا کا ایک مختصر ترین حصہ ہے انسان کا بنا د وجود اندھیروں اجالوں۔ اثبات اور نفی کے درمیان نبرد آزما خود اپنی وسعت کو منوانے، اپنے آپ میں پھیل کر تمام زمانے پر حاوی ہو جانے، خود زمانہ بن جانے کو بے قرار..... تنہائی سکون سے سطوت نے اپنے آنسو پونچھے۔ آنسو جو عرصہ دراز بعد اچانک اس کی خشک آنکھوں کو نمی بخشنے لگے تھے۔ آنسو تو ان کا درد بھی ہیں انسان کی متاع بھی...... سطوت کی تمام محرومیاں، اذیتیں، کربنائیاں اپنے ہمراہ بہا لے گئے۔

وہ ناکامی، چوٹ، نارسائی جس کے پیچھے ہمیشہ سفاکی ور انتقام کا جذبہ چھپا رہتا ہے ان مہربان آنسوؤں کی زد میں جانے کب سے گم ہو گئی۔

تب اگلے دن طالب علم لڑکیوں نے حیرت سے دیکھا کہ روکھی پھیکی ہنسی، قہقہوں سے عاری سخت گیر سطوت آپا کا تمام سراپا رنگین ملبوس میں باغ و بہار گلزار بنا ہوا تھا۔ ان کے کھچڑی بالوں میں

تازہ گلاب مہک رہے تھے، وہ ہمیشہ سے حد درجہ مختلف نظر آ رہی تھیں
اضطراب کی جگہ عافیت اور رنج کی جگہ مسرت کی پرچھائیاں سر تا قدم ان سے لپٹی ہوئی تھیں۔
اور لڑکیوں کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ سمجھ کر سطوت خاموشی سے سوچ رہی تھی۔ پگلیو، حیرت سے
کیا دیکھ رہی ہو مجھے۔ میں تو جہاں آپا سے چھینی ہوئی مسرت انھیں واپس لوٹانا چاہتی ہوں۔ میرا
ہاتھ بالآخر اس پھول تک پہنچ گیا ہے جو سب سے اونچی ٹہنی پر جھوما کرتا ہے۔ زندگی کی
تمام خوشبو اپنے آپ میں چھپائے اور عرصۂ دراز بعد مسکراہٹوں کے جواب میں سطوت یوں مسکرائی
جیسے سب کو جتا دینا چاہتی ہو کہ وہ زندگی کی طرف لوٹ آئی ہے۔ اب زندگی کو اس سے ہار
ماننی ہوگی۔

پہچان

بھاگتے بھاگتے وہ تھک گیا۔ سلگتا دہکتا ہوا منظر لاوے کی طرح کھول رہا تھا ابل رہا تھا اور چیخ و پکار اس کے کان چھیدے ڈال رہی تھی۔ اس منظر اور آہ و بکا کو خود سے دور کرنے وہ کسی ایسے مقام پر پہنچ جانا چاہتا تھا جہاں سکوت کے سوا کچھ نہ ہو لہٰذا جب تک قدموں نے ساتھ دیا وہ نہیں رکا مگر آخر کار گرا اور بے سدھ ہو گیا۔

تب مہربان زمین نے اپنی آغوش پھیلا دی اور تازہ ہوا نے شفقت سے اسے تھپکا تو وہ سب کچھ بھول گیا۔ جب جاگا تو اندھیرے کی چادر خوب تنی ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا لیکن سناٹے کے سوا کوئی آواز تھی نہ متنفس۔ جلتی ہوئی آنکھیں اور اپنا مجروح احساس۔

کس قدر خوفناک آگ تھی جو شدید غذا کی طرح آدمیوں اور چیزوں کو بھون کر نگل رہی تھی۔ بھر بھر بالٹیاں پانی کی انڈیلی جا رہی تھیں مگر شعلوں کی زبانیں جانے کون سا زہر چاٹ چاٹ کر ماند پڑنے مرنے کی بجائے بڑھتی بھڑکتی ہر ہر شے کو ختم کیے دے رہی تھیں۔ وہ تو بچ گیا شاید کچھ اور لوگ بھی بچ گئے ہوں گے لیکن بے حساب خاک ہو گئے۔ جب تک ہمت سلامت رہی وہ بھی دوسروں کے ساتھ مل کر زندگیوں کو بچاتا رہا لیکن جب آگ بجھانے والا عملہ آگیا تو بہ جان ناتواں نڈھال سا قدم قدم پیچھے ہٹنے لگا اور اب نہ جانے کہاں پہنچا ہوا تھا۔ اردگرد کو پہچاننے کی اب بھی نہ ہمت تھی نہ سکت بس ایک ہی منظر تھا جو نظر کے سامنے جم سا گیا تھا

ہٹ نہیں رہا تھا اور نالہ وشیون کی آوازیں جو آسمان تک رسائی پانے کو بے قرار تھیں اب تک اسے دہلائے ہوئے تھیں اس نے آنکھیں اور سختی سے بند کرلیں۔ جانے کب تک یونہی پڑا رہتا کہ بھیڑوں کے ممیانے کی آوازوں نے بے پناہ سکوت کو توڑ دیا اور کسی نے اس کا شانہ ہلایا۔ آنکھ کی جھری سے ایک انسان کو دیکھ کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ سیاہی مائل رنگت کا ایک تندرست نوجوان تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا۔ تب خود کو بمشکل سمیٹ سنبھال کر وہ بولا۔

”بہت بھوک لگی ہے کچھ کھلاؤ مجھے۔“

یہ سن کر چند منٹ تک چرواہا کچھ سوچتا رہا پھر پاس کے ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر اس نے اپنے مخصوص انداز میں سیٹی بجائی۔ یہ سیٹی دور دور تک گھوم کر جونہی ختم ہوئی کہیں دور بہت دور سے ایسی ہی ایک اور سیٹی ابھری اور ارد گرد کا طواف کرتی ہوئی ٹیلے سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی۔ وہ اپنی جگہ پڑا احمقوں کی طرح پلکیں جھپکاتا رہا۔ چرواہا ٹیلے سے اتر کر پھر اس کے نزدیک آیا اور کچھ ہی دیر بعد ایک نقطہ چھوٹے سے بڑا ہوتے ہوئے بالکل ان کے آگے آکر مجسم ہوگیا۔ صبح کی پہلی پہلی روشنی میں شام کی شبیہہ اس کے سامنے ٹھہری ہوئی تھی۔ سانولی گمبھیر جیسے کسی نے وارفتگی اور ٹھہراؤ کو خوب گوندھ کر ایک شکل دے دی ہو۔ سادہ سوچ جس سے یوں ظاہر ہو رہی تھی جیسے پکے ہوئے پھل سے ٹپکتا ہوا رس۔

وہ بھونچکا سا اس شبیہہ کو تکتا رہ گیا۔ چرواہے نے اپنے ہی لب ولہجے میں آنے والی سے کہا۔

”دوڑ کر دودھ لے آ۔ یہ آدمی اٹھ کر چلنے کے قابل نہیں ہے۔“ یہ سنتے ہی لڑکی جس طرح آئی تھی اسی طرح لوٹ گئی اور توقع سے بہت جلد کانسی کا ایک لوٹا لے کر لوٹی جو دودھ سے لبالب بھرا تھا اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لوٹا لیا اور بلا تاخیر ہونٹوں سے لگالیا۔ جب تک پورا دودھ اس کے پیٹ میں نہیں چلا گیا وہ لوٹے کے کنارے سے اپنے ہونٹ چپکائے رہا۔ پھر جب دودھ کی آخری بوند بھی ختم ہوگئی تو لوٹا دھر کر اس نے ایک طویل مطمئن سانس لی اور اپنی بے تحاشہ بھوک وندیدے پن پر خود ہی شرمندہ ہوگیا۔ تبھی قریبی پتھر پر ٹکے ہوئے چرواہے نے اس سے پوچھا ”کیا تم زخمی ہو، بیمار ہو یا کوئی تمہاری گھات میں ہے؟“ اور یہ پوچھتے ہوئے نیزے پر چرواہے کی گرفت غیر ارادی طور پر مضبوط ہوگئی۔

"پہلے یہ بتاؤ میں کہاں ہوں۔؟"

"تم اس وقت بستی سے دور ترائی میں ہو اور اس قابل نہیں کہ لوٹ سکو اس لیے ابھی آرام کرو جب چلنے کے قابل ہو جاؤ تب بے شک چلے جانا۔"

وہ چپ چاپ پڑا رہا۔

"میں ریوڑ لے کر آگے جا رہا ہوں تم اس آدمی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔" چرواہا دوبارہ لڑکی سے مخاطب ہوا تعمیلِ حکم میں لڑکی نے زبان کی بجائے جیسے آنکھوں سے کہا۔ اٹھو، آؤ میرے ساتھ اور وہ ہر طرح کی خود اختیاری بھول کر آہستہ آہستہ لڑکی کے پیچھے ہو لیا۔ کچھ دیر چل کر آخر کار وہ ایک جھونپڑی کے آگے رکے۔ لڑکی نے ایک چٹائی لا کر اس کے لیے بچھا دی اور خود اس سے تھوڑا پرے بیٹھ کر ادھوری والی چٹائی بننے لگی۔

پہلی بار اس نے محسوس کیا کہ لڑکی کا سراپا جتنا نازک ہے، لچکیلا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں اتنے ہی بھدے ہیں۔ ناچار چٹائی پر ٹک کر وہ چند لمحے اس غیر موزونیت کے بارے میں سوچا کیا پھر بے اختیار ایک سوال اس کی زبان سے ادا ہو گیا۔ "وہ کون ہے جس نے ہمیں یہاں بھیجا ہے۔؟"

"میرا بھائی ہے وہ۔"

"اور تمہارے ماں باپ۔"

"بستی میں سامان بیچنے گئے ہوئے ہیں۔ میری بُنی ہوئی چٹائیاں اور بھیڑوں کے دودھ سے بنا ہوا مکھن اور پنیر۔"

"مگر کیا یہ عجیب اور بے تکا نہیں لگتا کہ اکیلی لڑکی کے ساتھ ایک اجنبی کو بھیج دیا جائے؟"

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم مہمانوں کی عزت کرتے ہیں اور اپنی حفاظت کرنا بھی خوب جانتے ہیں۔ جب ہمیں درندوں سے محفوظ رہنا آتا ہے تو پھر انسان تو انسان ہی ٹھہرا۔"

اس جواب کی خود اعتمادی نے اسے لاجواب کر دیا۔ انتہائی تھکن میں پیٹ بھرنے کے احساس نے رفتہ رفتہ اس پر سرشاری طاری کر دی۔ بولتے بولتے وہ چٹائی پر لڑھکا اور اطمینان کی اس دنیا میں پہنچ گیا جہاں کبھی کبھی خوابوں کی بھی مجال نہیں تھی کہ اپنا رنگ جما سکیں۔ دن ڈھلا، شام آ گئی۔ شام کے ساتھ ہی بھیڑیں اپنے ٹھکانے کو واپس پلٹیں۔

چرواہے نے انھیں باڑے میں دھکیل کر کانٹے دار دروازہ بند کیا اور بہن سے پوچھا۔
"کیا یہ سارا دن سوتا رہا ہے؟"

"ہاں!" بہن مسکرائی۔ "جس رفتار سے اس نے دودھ پیا تھا، اسی رفتار سے اب نیند میں مگن ہے۔"

دونوں کی یہ بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ان کے ماں باپ بھی لوٹ آئے۔ چرواہے نے انھیں مختصراً اجنبی کی بابت بتایا اگرچہ کہ بڈھا بڈھی نے تعلیم نہیں پائی تھی اور تہذیب و تمدن کو نہیں دیکھا برتا تھا مگر اچھے برے کی پرکھ ضرور رکھتے تھے لہٰذا جیسے ہی چرواہے نے اجنبی کو جگا کر ان دونوں کو ملوایا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرا کر نہایت مسرت سے اس کا سواگت کیا اور اپنے ساتھ بٹھا کر بڑی اپنائیت سے اسے پیاز، پنیر اور روٹی کھلائی۔ پھر تھکا ہوا چرواہا اور اس کا باپ فوراً ہی چٹائی پر پسر گئے اور ماں لڑکی کو ساتھ لے کر جھونپڑی کے اندر چلی گئی۔

وہ اپنی چٹائی پر بیٹھا بڑی بے دردی سے آنکھیں مل مل کر سوچنے لگا۔ کہیں یہ سب خواب تو نہیں خوف سے نجات کا ایک سہانا پس منظر۔؟

روشنی رخصت ہو چکی تھی اور اندھیرا پھر سارے میں اتر آیا تھا۔ اس کا دل شدت سے دھڑکا۔ کہیں اب اندھیرا ہی تو اس کا مقدر نہیں بن گیا۔؟ مگر تاروں سے چھنتی ہلکی ہلکی جگ مگ میں اس کے قریب ہی بے خبر سویا ہوا چرواہا اس وقت اسے ایک مضبوط سہارا معلوم ہوا۔ اس نے خود کو یقین دلایا کہ یہ کوئی پس منظر نہیں حقیقت ہے یہ اور بات ہے کہ دنیا بڑی عجیب جگہ ہے جس کے کچھ حصوں میں اس وقت رونقیں اپنے عروج پر ہوں گی مگر اس حصۂ زمین پر اس وقت نہایت اٹوٹ خاموشی، دم بدم گاڑھی ہوتی ہوئی تاریکی۔ اور آگ تاریکی ہی میں تو بھڑکی تھی۔ تاریکی نے پھر اس کے احساس میں پنجے گاڑ دیے۔ تاریکی اس دشمن کی طرح لگی جو مسلسل اس کا تعاقب کیے جا رہا ہو۔ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ کوئی نئی زور سے ہنسے کہ اجلا اُس ہنسی سے فوارے کی طرح ابل کر تاریکی پر چھا جائے اور اس کے اپنے زخمی وجود سے رس رس کر لہو زمین میں ملے تو پھولوں کی طرح اُگے اور تمام پھول مل کر زندگی کو ایک نیا منظر

فراہم کریں۔ نیا طور، نئی جہت دیں۔

گھسی پٹی فارمولا زندگی اسے کتنا تھکا چکی ہے۔ صبح سے شام تک کام کرنا شام پڑے پیٹ کا دوزخ بھرنا، نیند آئے تو سو جانا ورنہ وقت کے آنسو خرچ کرنا۔ اب تو وہ مقام بھی نہ رہا جہاں رات گذار کر وہ خود کو ایک ٹھکانے کی تشفی دے سکتا تھا۔

اسی درد میں گھلتے گھلتے اس کے پپوٹے پھر جھک گئے اور اس وقت کھلے جب اچانک کوئی چیز اس کے چہرے پر کلبلائی۔ گھبرا کر ہاتھ کے غیر ارادی جھٹکے سے اس نے کلبلاتی ہوئی چیز کو پرے اچھال دیا پھر اپنے خوف پر خود ہی نادم ہوا تھا۔ کیونکہ وہ سوکھی گھاس کے چند تنکے تھے جو پیڑ پر بیٹھی چڑیا کے چونچ سے چھوٹ کر اس کے چہرے پر آ پڑے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے قریب پڑے ہوئے وہ تنکے سمیٹے اور انہیں اپنی ہتھیلی پر پھیلا لیے۔

تو کیا گھونسلے بنانے کا موسم آ گیا!۔

اس نے سر او پچار کے پیڑ کو بغور دیکھا جس پر بیٹھے بے فکر پرندے آزادی کے نغمے الاپ رہے تھے۔ وسعتوں کی مدح کر رہے تھے۔ خوب چہچہا کر وہ اپنے پنکھ پھڑپھڑاتے پھر دور تک اڑتے چلے جاتے۔ فضا میں تیراکی کا یہ مظاہرہ اسے بھلا لگا۔ جب گھر بن جائیں گے تو یہ پرندے انڈے دیں گے پھر اونچی پروازوں میں ہمہ تن منہمک ہو جائیں گے۔ اس خیال نے یکلخت اس میں پھرتی بھر دی۔ وہ ایک کر چٹائی سے اٹھا اور نرم نرم صبح صبح کو اپنے اندر میٹھے گھونٹ کی طرح بھر کر مسکرایا۔ اس وقت تک بڈھا بڈھی چرواہا سب اپنے اپنے کاموں پر روانہ ہو چکے تھے۔ صرف لڑکی تھی جو دھوپ کے زعفرانی آبشار تلے سونے کی طرح ودیتی اپنی مشغولیت میں گم تھی۔ تب چپکے سے اس کے نزدیک پہنچ کر وہ بولا۔

"کام کام کام، تم ہر وقت کام ہی کیوں کرتی رہتی ہو؟"

"کیونکہ مجھے بے کاری پسند نہیں ہے۔"

"تم نے کبھی پرندوں کو دیکھا ہے؟ کس طرح چہچہاتے اڑتے ہیں؟"

"نہیں مجھے پرندوں سے دلچسپی نہیں ہے۔"

"عجیب بات ہے، کیوں آخر؟"

"انھیں دیکھنے سے کیا ملے گا۔؟"

"خوشی اندرونی خوشی اور جینے کی تمنّا!"

لڑکی خاموشی سے سر جھکائے اپنا کام کرتی رہی۔

"اچھا اگر تمھیں بہت سا پیسہ مل جائے تو کیا کروگی۔ کام کرنا چھوڑ دوگی۔؟"

لحظہ بھر کو ہاتھ روک کر لڑکی نے اسے دیکھا۔

"کیا تمھارے پاس بہت پیسہ ہے۔؟"

اس سوال نے اسے سپٹا دیا اور تذبذب کو اس کے چہرے پر دیکھ کر لڑکی مسکرائی "ہمیں پیسہ نہیں چاہیے۔ ہم محنت کرتے، پیٹ بھر کھاتے، بے فکر سوتے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی خزانہ نہیں جو پریشان کرے ہاں کبھی کبھی فضائی طوفان البتہ ہمیں پراگندہ کر دیتے ہیں ورنہ آرام ہی آرام ہے۔ چلو اب دانت صاف کرلو اور ناشتہ کرلو۔ بھائی تمھاری راہ دیکھ رہا ہوگا۔"

وہ لڑکی کے قریب سے ہٹ کر مٹکے کے قریب پہنچا اور پانی لے کر دانت صاف کرنے لگا۔ جب اس نے اپنے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مارے تو اچانک ہی ایک لمحے کو اس کا جی چاہا مٹکے کا تمام پانی لڑکی پر انڈیل کر دیکھے۔ اپنے دل تو دیز پیچ و خم کے ساتھ وہ کیسی لگتی ہے لیکن اگلے ہی لمحے سارے جنگل نے جیسے گونج کر کہا۔

خبردار۔ یہ یہاں کی ریت نہیں۔ یہاں بسنے والے معصوم و بے غرض ہوتے ہیں مکر عیاری کے لیے ان کے نیزے بہت نشانہ باز اور چاقو بہت دھاردار۔ پھر کیا ختم د کوئی چیز نہیں۔؟

بے حد ندامت سے اس نے اپنے منہ میں بھرا ہوا پانی اگل دیا اور بغیر کچھ کھائے ہی دوڑ پڑا۔

"ارے ارے"۔ لڑکی چلّائی اور حیرانی سے اسے جاتا ہو دیکھتی رہ گئی لیکن اس نے پلٹ کر ایک بار بھی پیچھے نہیں دیکھا سیدھا چرو' ہے کے پاس پہنچ لڑکا اور ت سے بولا۔ "میں جا رہا ہوں۔ تمھاری مہمان نوازی کا شکریہ۔" چرو ہے نے ایک دم کہ

اڑسا ہوا چاقو نکال کر کھولا۔

"تم بھاگ کیوں رہے ہو۔؟ اتنے پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہو۔؟"

ایک منٹ کے بیے چاقو کی چمکتی ہوئی دھار نے اس پر کپکپی طاری کر دی مگر اگلے ہی لمحے اس نے پوری بے خوفی سے دھار کے آس پاس انگلی پھیر کر پوچھا۔

"کیا اسے روز سان پر چڑھاتے ہو؟"

چرواہے نے اس کی صاف آواز سنی۔ اس کی شفاف آنکھوں کو دیکھا۔ اس کی بے خوفی کو محسوس کیا تو چاقو بند کر کے کمر میں کھونستے ہوئے مسکرایا۔

"ہاں، ہم اپنے ہتھیاروں کو کند نہیں ہونے دیتے۔ یہی تو ہمارے محافظ ہیں، درندے ہوں کے لٹیرے ان کے وار سے کوئی نہیں بچ سکتا۔"

"تم ایسا کرو کوئی سا جنگلی پھل توڑ لاؤ، چھوٹے سے چھوٹا اور اسے جتنی تیزی سے اچھال سکتے ہو اچھالو اگر میرا نشانہ خطا کر جائے تو بے شک میرے ہتھیار سے میری ہی جان لے لینا ورنہ ورنہ ....."

"خوب" وہ مسکرایا۔ "مطلب یہ کہ بھاگتے ہوئے کو بھی گرا سکتے ہو۔؟"

"ہاں" چرواہا بولا

"تبھی اتنے بے خوف ہو تم لوگ۔"

"لیکن تم اس قدر جلد کیوں جا رہے ہو، کچھ روز رہ لیتے۔ دودھ مکھن پنیر اور تازہ ہوا سے اپنے اندر خوب طاقت بھر لیتے تب بے شک چلے جاتے۔"

"نہیں مجھے جانا ہی چاہیے" اس نے سوچا۔ "آگ کتنی بھی شدید سہی۔ آہ دل کا کتنی بھی المناک سہی مگر جینے کی تمنا کیا ان سے زیادہ خطرناک نہیں تب اچھل کر اس نے ایک بے پروا تتلی پکڑی غور سے اسے دیکھا پھر آزاد کرتے ہوئے بولا "شکریہ دوست تمہارا بہت بہت شکریہ تم نے مجھے بے خوفی سے جینا سکھایا ہے پھر تم سے ملاقات ہو نہ ہو تم ہرگز نہ بھلائے جاؤ گے۔

"تم بھی" چرواہے نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے "جاؤ آسمان تمہاری مدد کرے" اس نے جھک کر چرواہے کے ہاتھ چومے مگر سر اٹھا کر آسمان کو نہیں دیکھا بلکہ دنیا کے زخموں کو خود میں بسائے جنبی انجان گھاٹی میں اتر گیا۔ زندگی کو ازسر نو جینے کے لیے۔

پرتو

بڑی ماں، بڑی ماں آجائیے چھوٹی ماں آپ کو یاد کر رہی ہیں۔"

"ابھی آتی ہوں پانچ منٹ میں۔" صبوحی نے کہا۔ ان پانچ منٹوں میں اندر جا کر کام نمٹانے کی بجائے روزی برابر کواڑ پکڑے کھڑی رہی اور خاصی بے چین رہی۔ پھر جیسے ہی صبوحی آئی روزی نے بلا تاخیر دریافت کیا۔

"اتنی دیر لگا دی آپ نے، کیا کر رہی تھیں وہاں؟"

"میں کھانا کھا رہی تھی روزی۔"

"کھانا، توبہ توبہ!۔۔" روزی نے اپنے رخسار پیٹے "آپ کو وہاں کھانا نہیں کھانا چاہیے تھا بڑی ماں۔"

"کیوں، کیوں بھلا؟" حیران پریشان صبوحی نے پوچھا۔

"کیونکہ آپ مسلمان ہیں اور وہ لوگ ہندو۔"

"تو۔۔؟ پھر اس سے کیا۔۔؟" صبوحی بھولپن سے بولی۔

"اس سے گناہ ہوتا ہے بڑی ماں اور کیا۔"

"گناہ۔۔؟"

"ہاں ہاں۔ اب ممی آکر خفا ہوں گی دیکھ لینا۔" روزی نے یقین دلایا۔

"لیکن میں کیا کرتی روزی ان لوگوں نے اتنے پیار سے اتنے اصرار سے روکا مجھے کہ میں

انکار نہیں کر سکی۔"

"یہی تو گڑ بڑ ہے ساری۔ پیار کی آڑ لے کر لوگ تمام کام کروا لیتے ہیں۔"

"مطلب۔"

"مطلب یہی کہ آپ نے اپنا مذہب میلا کر لیا ہے اب۔ آپ کچھ بھی کہہ کر ٹال سکتی تھیں انھیں۔ کوئی بہانہ بنا سکتی تھیں۔"

"کیا بہانہ بنانا اچھا لگتا روزی۔؟ کیا وہ سمجھ نہ جاتے؟"

"سمجھ جاتے تو بھی آپ کا کیا بگڑتا۔"

"اب چپ کرو روزی، بہت بول چکیں تم۔ اگر ممی آ کر ناراض ہوں گی تو میں منالوں گی انھیں لیکن خدا کے لیے اب تم ایک لفظ آگے نہ کہو۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے ——" کچھ کہتے کہتے روزی نے اپنا منہ بند کر لیا مگر جذبۂ حقارت اس کے چہرے پر علانیہ محسوس ہو رہا تھا۔

"آپ چھوٹی ماں کے ساتھ کھیلنے میں کام کروں گی جا کر۔" یہ کہہ کر روزی جانے کے لیے پلٹی تو صبوحی نے زبان نکال کر اس کی پیٹھ کو چڑایا —— اور کھینچ کر اس کی نقل اتاری: "آپ چھوٹی ماں کے ساتھ کھیلیے اونہہ!"

اُدھر کام کرتے کرتے روزی اُن تمام سوالات کے جوابات اپنے ذہن میں اکٹھے کرنے لگی جو اس ناگاہ صورتِ حال پر میم صاحب کی طرف سے متوقع تھے۔ اگر میم صاحب یہ کہیں گی تو وہ یہ کہے گی۔ اگر میم صاحب اس طرح پوچھیں گی تو وہ یوں جواب دے گی حتیٰ کہ سوالات اور جوابات کی ایک لمبی فہرست روزی کے ذہن میں پوری طرح مرتب ہو گئی۔ اس خوف کے ساتھ کہ آخر کو جواب دہ تو وہی ہے۔ اب اگر بڑی ماں نے وہاں کھانا کھا لیا تو میم صاحب تو اسی کو پوچھیں گی اور صاف کہہ دیں گی۔ صبوحی تو بچی ہے ابھی۔ تم کیا کرتی رہیں گھر کو لک آؤٹ کرنے کا یہی طریقہ ہے کیا کہ سب کچھ ہو جانے کے بعد اس کے نتائج و عواقب پر توجہ دی جائے؟

کام کرتے کرتے روزی بظاہر اپنے سیدھے چھریرے بالوں میں گھنگھر پیدا کرنے کے

مختلف طریقوں پر غور کرتی جا رہی تھی لیکن یہ باطن یہ خوف اسے ہراساں کیے جا رہا تھا کہ ہندوؤں کے گھر کا بنایا ہوا کھانا کھانے سے مسلمان مذہب ضرور آلودہ ہو گیا ہے۔ مذہب کے معاملے میں روزی بڑی کٹر تھی۔

ہر صبح جاگ کر بستر سے اترے بغیر وہ اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی سے اپنے سینہ پر صلیب بناتی پھر پھرتی سے نہا دھو کر یسوع مسیح کی تصویر کے آگے پوری عقیدت سے نئی کینڈل جلاتی۔ تصویر کے آگے ہمہ وقت جلتے ہوئے چراغ کو خوب تیل پلاتی تب خوشبودار اگربتیاں سلگا کر پورے احترام اور اعتقاد سے تصویر کے چوکھٹے کو بوسہ دیتی اس سے اپنا ماتھا چھواتی اس کے بعد پورے دھیان سے مختلف دعائیں پڑھتی جن میں نجات کی دعا اور تمام دعاؤں پر حاوی ہوتی اور اس مصروفیت سے فارغ ہونے کے بعد ہی وہ دن بھر کے اپنے دوسرے کام شروع کرتی۔

"بڑی ماں ——"

"چھوٹی ماں ——"

"جاگیے، جاگیے ——"

وہ دونوں کو پیار دلار سے جگاتی۔

"اٹھیے چائے بالکل تیار ہے۔"

دونوں لڑکیاں ذرا سی آنا کانی کے بعد اٹھتیں۔

"صبح بخیر روزی۔"

"صبح بخیر ——"

روزی جھک کر دونوں کی پیشانی چومتی، ساتھ ساتھ حکم صادر کرتی۔

"چائے پیتے ہی غسل خانے چلیے۔ آپ کے کپڑے تولیے سب رکھ دیے ہیں میں نے۔"

اور جب تک لڑکیاں حمام کرتیں روزی صاحب امیم صاحب کو چائے پہنچاتی ساتھ ساتھ اخبار اور تازہ ڈاک بھی لے جاتی۔

بچیاں نہا دھو کر میز پر آتیں تو صاحب کے لیے غسل خانہ خالی ہو جاتا تب تک صاحب

اخبار اور ڈاک بھی دیکھ لیتے لیکن میم صاحب کا چہرہ نہانے سے پہلے نو دیتا ہوتا پھر اسی نوکی چھوٹ روزی کو بڑی ماں چھوٹی ماں کے چہروں پر نظر آتی۔

جانے کیسی روشنی تھی یہ۔؟

ہر رات فرائض کی تکمیل کے بعد سرونٹ کوارٹر لوٹ کر اپنے کمرے کے چھوٹے سے آئینے میں روزی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے چہرے کو تکتی مگر کسی دن کسی رات کسی روز بھی۔ وہ جوت، وہ تیج، وہ نکھار اسے اپنے چہرے پر نظر نہ آیا جو میم صاحب، بڑی ماں اور چھوٹی ماں کے چہروں پر تھا۔ کئی بار جب لڑکیاں اسکول سے لوٹ کر تھوڑے آرام کے بعد ممی پاپا کے ساتھ شام کی سیر کو چلی جاتیں تو روزی جلدی جلدی میم صاحب کا ڈریسنگ کیبنٹ ٹٹولتی وہاں اسے تمام ضروری چیزیں مل جاتیں لیکن وہ خاص چیز جو اس کی دانست میں چہرے پر روشنی پیدا کرنے کی ذمہ دار تھی کہیں نظر نہ آتی۔

میک اپ کی وہ تمام چیزیں تو بڑی کامن تھیں جو تقریباً تمام ماڈرن عورتیں استعمال کیا کرتی تھیں لیکن ہر ایک کے چہرے پر وہ دل آویز دمک تو نہیں ہوتی تھی جو اس کی میم صاحب سے وابستہ تھی۔

تفریح سے لوٹ کر دونوں لڑکیاں شام کو ماسٹر سے ٹیوشن لیتیں جس کے بعد رات کا کھانا کھلاتے کھلاتے روزی بڑی واضح ترغیب دیتی۔

"آج شکر قندی کی کھیر بنی ہے بڑی ماں، آپ کو بہت پسند ہے نا۔"

"سچ روزی" صبوحی بے پناہ خوش ہو جاتی۔

"اور چاکلیٹ کیک بھی تو لائے ہیں ممی پاپا۔ چھوٹی ماں سن رہی ہیں آپ؟"

کھاتے کھاتے ہاتھ روک کر اپنی چمکیلی نظریں پلیٹ سے ہٹا کر صبا دلار سے روزی کو دیکھتی۔

"چاکلیٹ کیک لائے ہیں ممی پاپا تو کھانے کے بعد بطور سویٹ ڈش دو گی نا مجھے تم روزی؟"

"دوں گی، دوں گی۔ لیکن ایک بات بتلائیے پہلے۔"

"کون سی بات؟ پوچھو نا روزی۔"

اگر چہ آس پاس کوئی نہ ہوتا۔ خانساماں کچن میں ہوتا اور صاحب میم صاحب مصروف پھر بھی روزی پوری رازداری سے مکمل آہستگی سے دریافت کرتی۔

"یہ بتائیے، آپ لوگ رات میں کیا چیز منہ پر لگا کر سوتے ہیں۔؟"

"کچھ بھی تو نہیں روزی ـــــ" دونوں لڑکیاں حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتیں پھر روزی کو مزید یقین دلائیں "کچھ بھی تو نہیں روزی۔"

"تب۔؟"

"تب کیا۔؟" صبوحی صہبا بے یقینی سے اسے گھورتیں۔

"تب کیا آپ کے چہروں پر روشنی ایسے ہی پھیل جاتی ہے۔ اپنے آپ۔؟"

"روشنی؟ کیسی روشنی۔؟"

روزی اداس ہو جاتی۔ اسے یہ جواب سراسر جھوٹا لگتا۔ وہ بڑی بے دلی سے سنہری کنارے والے پیالے میں شکر قندی کی کھیر بڑی ماں کے آگے رکھتی اور چاکلیٹ کیک کا ایک مناسب ٹکڑا پھولدار کناروں والی طشتری میں رکھ کر چھوٹی ماں کو پیش کرتی اور خود گم صم سی کھڑی ہو جاتی۔

"مگر تم ایسا کیوں پوچھ رہی ہو روزی۔ تمہیں کچھ چاہئے کیا۔؟" کھیر کھاتے کھاتے صبوحی بات اٹھاتی۔

"وہ کیا ہے آپ کے پاس۔"

"کیا چیز۔؟"

"وہی کریم جس سے......"

"میرے پاس تو نہیں مگر ممی کے پاس ہے ضرور لا دوں گی تمہیں۔" صبوحی اسے یقین دلاتی۔

"وہ کریم جو ڈریسنگ کیبنٹ پر رکھی ہے۔؟"

"وہی تو۔"

روزی کو زبردست مایوسی ہوتی۔

میم صاحب کی وہ کریم تو روزی نے بھی موقع محل دیکھ کر اکثر اپنے چہرے پر ملی تھی مگر یہ برگزیدہ کریم نہیں تھی جس کا روشنی سے رشتہ تھا۔

اور جھوٹے برتن سمیٹتے سمیٹتے روزی سوچتی۔ آخر کس طرح اپنے چہرے پر میم صاحب جیسا تیج پیدا کرے۔ اس کی تو کوئی بھی کوشش اس سلسلے میں بارآور نہیں ہو رہی تھی۔

تو اس دن بھی جب بڑی ماں چھوٹی ماں کو کھیلتا ہوا چھوڑ کر روزی گھر کے کام میں لگی ہوئی تھی میم صاحب کے آنے پر گھبرا گھبرا کر چھپنے لگی۔

میم صاحب نے گھر میں داخل ہوتے ہی روزی کو پکارا "روزی ــــ روزی ــــ"

مگر ہمیشہ ایک آواز پر حاضر ہونے والی روزی اس وقت ندارد تھی۔

"کہاں ہو روزی ــــ؟" میم صاحب نے دوبارہ آواز دی۔ اس بار صبوحی اور صہبا دوڑتی ہوئی آئیں۔

"کیا روزی کہیں گئی ہوئی ہے؟" ماں نے دونوں سے پوچھا۔

"نہیں تو ممی روزی تو گھر پر ہی ہے"

"پھر آتی کیوں نہیں، کیا کر رہی ہے"

"روزی ــــ" صبوحی نے آواز دی۔

"روزی ــــ" صہبا نے پکارا۔ مجبوراً سہمی سہمی گھبرائی سی روزی آئی چور دل کی طــرح۔

"کیا بات ہے روزی، کیا آج تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے"

"ٹھیک تو ہے میم صاحب"

"کسی نے کچھ کہا تمھیں۔؟"

"جی نہیں"

"صبوحی صہبا نے ستایا ہے کیا۔؟"

"بالکل نہیں میم صاحب" اور اس سے پہلے کہ میم صاحب کچھ اور پوچھتیں روزی جھپک سے یہ جا وہ جا کمرے سے باہر نکل گئی۔ میم صاحب نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"ہوا کیا ہے کمبخت کو۔ ؟"

تبھی صبوحی نے دل میں سوچا۔ اسے ممی سے کچھ نہیں چھپانا چاہیئے، ممی کو ساری بات بتا ہی دینا چاہیے لہٰذا وہ بولی۔ "سوری ممی" اور اتنا کہتے کہتے صبوحی کی آواز پھنس پھنس گئی۔

"سوری۔ ؟ مگر کیوں۔ ؟ بات کیا ہے صبوحی۔ ؟" ماں نے غور سے صبوحی کو دیکھا۔

"ہم سے انجانے میں بھول ہو گئی ممی لیکن آپ اطمینان رکھیں آئندہ کبھی نہیں ہو گی" صبوحی نے شرمندگی سے گویا اعتراف کیا۔ روزی دروازے میں کھڑی بار بار صلیب بنا بنا کر منہ ہی منہ میں بدبدا رہی تھی۔ مرسی جیزز، مرسی۔!

"دراصل ان لوگوں نے زبردستی ہمیں روک لیا ممی ہم نے منع بھی کیا لیکن وہ نہیں مانے ہمیں بھی اپنے ساتھ چاول اور سبزی کھلا دی" صبوحی ڈرتے ڈرتے بولی۔

"کن لوگوں نے مگر۔ ؟"

"یہی اپنے پڑوس والی آنٹی شکلا اور ان کے بچوں نے"

"اچھا اچھا، تب ؟"

"تب کیا اس طرح کچھ بھی نہیں ہوا ممی"

"اس میں کچھ ہونے کی کون سی بات ہے بیٹی"

"مگر۔ روزی تو کہتی ہے ہم نے ان کا ہندوؤں کا بنایا ہوا کھانا کھا کر اپنا مسلمان مذہب میلا کر لیا ہے"

"بے وقوف پاگل ہے روزی، تو اسی لیے گھبرا رہی چھپ رہی ہے آج۔ بلاؤ کہاں ہے وہ"

روزی دروازے کی اوٹ سے نکل کر جھٹ پٹ میم صاحب کے سامنے حاضر ہوئی۔ ابھی چند منٹ پہلے کی ڈری ڈری مری مری روزی کی بجائے ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش روزی۔

"کیا کہا تم نے روزی" میم صاحب نے اسے دیکھا۔

روزی چپ کھڑی رہی۔

"ایسے نہیں کہتے روزی، ایسا نہیں سوچتے۔ بچوں کے ذہن میں ایسی وابیات

بے سر و پا باتیں نہیں ٹھونستے۔ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ مل جل کر رہنا اور ایک دوسرے کے اچھے برے میں کام آنا ہر انسان کا اخلاقی فرض ہوتا ہے۔ آپسی محبت بہت بڑی طاقت ہے روزی۔ خواہ مخواہ گھبرا دیا تم نے صبوحی کو۔ جو ہوا سو ہو گیا۔ آئندہ پھر ایسا کبھی مت کرنا بلکہ جن کے ہاں اپنے بچے جاتے ہیں انھیں بھی خصوصی طور پر اپنے ہاں بلا کر خاطر مدارات کرنا اور سبھی آنے والوں کا خاص خیال رکھنا، یہی ہماری تہذیب ہے۔ اس سے خود تمھیں بہت خوشی ہوگی روزی سمجھیں، مہمان نوازی تو بہترین عادت ہے۔ کیا۔؟"

"جی میم صاحب" روزی نے بڑی فرماں برداری سے اثبات میں سر ہلایا اور پھر سہ پہر ہوتے ہی وہ چائے کی ٹرے سجا کر چلی۔

تمام بچے حسبِ روایت مہربان آنٹی شکلا کے گھر میں جمع تھے اور کھیل رہے تھے۔ ممی کی گفتگو کے بعد صبوحی اور صہبا بھی وہیں تھیں کہ روزی ٹرے میں کیک بسکٹ اور چائے لیے سب کے درمیان نمودار ہوئی۔ "آؤ بچو چائے پی لو۔"

"ارے ارے" آنٹی شکلا بولیں "تم نے کیوں اتنی زحمت کی روزی، بے کار میں!"

"آنٹی جی آنٹی جی ......" فہمائشی انداز میں ہاتھ ہلا کر روزی نے جیسے آنٹی شکلا کو تنبیہہ کی "اس طرح نہیں کہتے اپنوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ برا لگتا ہے۔"

آنٹی شکلا اور روزی کی گفتگو سے بے پروا تمام کھیلتے ہوئے بچے کھیل چھوڑ کر کیک بسکٹ پر ٹوٹ پڑے سکرا مسکرا کر انھوں نے پوچھا۔

"دیدی روزی یہ بتلایئے آپ صبوحی اور صہبا کو ان کے نام سے کیوں نہیں بلاتیں۔ بڑی ماں چھوٹی ماں کیوں کہتی ہیں آخر؟"

"اس لیے بچو کہ میرے بابا کہتے ہیں کہ مالکوں کے بچے کتنے بھی چھوٹے سہی ان کی عزت بھی ملازموں پر لازم ہے۔ مالکوں کے بچوں کو نام سے بلانا بدتمیزی ہے اور مسلمان گھرانوں میں لڑکیوں کو ویسے بھی ان کے رشتہ داروں سے نہیں بلایا جاتا بس اس لیے۔ سمجھ گئے آپ لوگ۔؟" روزی نے بالکل اپنی میم صاحب کے انداز کو دہرایا۔

"اوہو۔ اس لیے" بچوں نے مسکرانا، مذاق بنانا بند کر دیا اور چائے سے انصاف کرنے لگے۔

"تھینک یو روزی"، مسوجی اور صہبا نے بھرپور مسرت سے کہا۔
روزی نے چپکے سے اپنے سینے پر صلیب بنا کر من ہی من دعا کی۔
ہم سب پر اپنی مہربانی رکھنا یسوع مسیح۔ ہم سب پر، ساری دنیا پر اپنی مہربانی رکھنا۔
اس سے اگلی صبح نہا کر بال بنانے جب روزی آئینے کے آگے پہنچی تو یکلخت ششدر رہ گئی۔
وہی روشنی وہی تیج جس کی اسے ہمیشہ جستجو رہی آج خود بخود اس کے چہرے پر موجود تھا۔
"مائی گوڈ....." ہکابکا روزی گھٹنوں کے بل یسوع مسیح کی تصویر کے آگے جھک گئی۔ تو یہ پیار کی روشنی ہے..... روزی نے فوراً اپنے سینے پر کراس بنایا اور شدتِ مسرت سے آنکھیں بند کرلیں۔
اس دن کی دعاؤں میں جتنا سکون جتنی عافیت و طمانیت اسے ملی شاید ہی کبھی پہلے ملی تھی۔

عفریت

(فسادات پر مبنی کہانی)

یاد نہیں آتا کہ پہلے بھی وہ تھا۔

نہیں تھا کبھی نہیں تھا۔ کہیں نہیں تھا۔

بس یکایک ہی اس نے جنم لیا اور دیکھتے دیکھتے بالغ ہو گیا۔ اس کے پیروں کی جگہ دو لاٹھیاں تھیں۔ ہاتھوں کی جگہ دو نیزے۔ جبڑوں کی جگہ مگرمچھ اور دانتوں کی جگہ کلہاڑے۔ دماغ لومڑی کی طرح عیار مکار اور منہ اژدہے کی خوفناک پھنکار لیے۔

بچے اسے دیکھ کر رونے لگتے۔ عورتیں واویلا مچا دیتیں۔ مرد گھبرا گھبرا کر اکٹھے ہوتے مگر اس کے کاری وار سے کٹ پھٹ کر تتر بتر منتشر ہو جاتے، بچھڑ جاتے، سب پر حاوی وہ موت کی طرح ہر طرف چھا جاتا۔

اس کی تمام شخصیت پھانسی کے پھندے کی طرح تھی۔ انسان کے خاتمے پر مصر۔

جب میں نے پہلی بار گلی کے نکڑ پر اسے دیکھا تو سہم کر بھاگ کھڑا ہوا کیونکہ وہ وہاں موجود ہر متنفس کو سوکھی گھاس کی طرح آگ دکھا رہا تھا۔ کچی شاخوں کی طرح توڑ مروڑ رہا تھا۔ زمین آسمان دہلا دینے والی چیخیں فضا کے کان پھاڑتی ہوئی ہر طرف چیلوں کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھیں لیکن تمام نالہ و شیون سے بے نیاز وہ اپنی بہیمیت میں مصروف مسرور تھا۔ اس خون خرابے اور آہ و بکا سے بچ کر میں جب گھر پہنچا تو حد سے زیادہ ہولایا ہوا تھا۔ میری نظروں میں خون کے فوارے اڑ رہے تھے۔ انسانی گوشت کے لوتھڑے بکھر

رہے تھے ۔ بے حد دہشت زدہ ۔ اس روز میں اپنے بچوں سے کھیل سکا نہ بیوی سے بول سکا۔ دفتر کے ضروری کام کا بہانہ بنا کر میں نے کواڑ بند کر لیا اور تکیوں میں منہہ دبیے اکیلا ہی پڑا رہا۔

پھر دوسری بار میں نے اسے بستی میں دیکھا جہاں وہ تمام مردوں کو آناً فاناً کچل کر بے بس عورتوں کو اپنی مضبوط گرفت میں لیے انھیں برہنہ بے آبرو کر رہا تھا اور ٹھینیوں کی طرح چنگھار رہا تھا۔

کمبخت پاجی، میں دل ہی دل میں بڑبڑایا اور اپنے راستے لپک گیا۔ اس کی آہنی قوت کے مشاہدے کے بعد بے کس لوگوں کی مدد کرنے کا خیال اپنے آپ زخمی دماغ سے نکل گیا۔ میں اندر ہی اندر کھولتا رہا مگر اس کے سامنے کی اس سے مقابلے کی مجھ میں ہمت نہ تھی تیسری بار میں نے اسے ایک معروف شاہراہ پر دیکھا جہاں وہ سب کو تیزاب سے جھلس جھلس کر مسخ کر رہا اور تڑپنے والوں کی آہوں اور کراہوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔ سب کے سینوں میں چھرے گھونپ گھونپ کر خون کی برسات میں نہایا ہوا نہال تھا۔ اس منظر کی ہولناکی سے میں اندر ہی اندر پھڑ پھڑایا تڑپا لیکن میرا غصہ ظاہر نہ ہو سکا ۔ میری آواز حلق سے باہر نہ نکل سکی وہ ظالم، زانی قہر کی طرح خوفناک وبا کی طرح سفاک کوڑھ کی طرح متعفن اپنی حیوانیت میں معروف رہا اور میں پھر بزدلوں کی طرح سرپٹ بھاگ کھڑا ہوا۔

پھر چوتھی بار، پانچویں بار ۔ بار بار یہی سوچتا رہا بالآخر میں نے تہیہ کر لیا اب او رخاموش نہ رہوں گا کسی نہ کسی طرح اسے ختم کر کے ہی دم لوں گا ۔ اپنی شدید نفرت اور برہمی کے ساتھ جیسے ہی اس کے قریب پہنچ میرا سر چکرایا۔ حوصلہ جواب دے گیا اس کے آگے نہ ٹک پاکر میں پانی کی طرح بہہ گیا۔ تیورایا۔ نہ جانے کب تک بے حواس رہا جب حواسوں میں آیا تو اطراف مچی ہوئی چیخ دپکار، بھگدڑ۔ وحشت دوحشت ، نالہ وشیون کچھ بھی نہ تھا۔ گہرا موت جیسا سکوت ہر طرف مسلط تھا۔ خون میں لت پت پھٹے ہوئے جسم کٹے ہوئے اعضا نچے ہوئے گوشت کے لوتھڑے میرے اطراف پھیلے ہوئے تھے ۔ جلے ہوئے گوشت کی سڑاند اور جمے ہوئے خون کی بساندھ میرے نتھنوں سے دماغ تک پہنچی تو میں پھر اپنی بمشکل تمام اکٹھا کی ہوئی

طاقت کو بر کر تیولیا اور دوبارہ زمین پر گر پڑا۔ میرا سر تیزی سے گھوم رہا تھا اور آنتیں جیسے
کھنچ کر منہ میں آئی جا رہی تھیں۔ طبیعت اس طرح مالش کر رہی تھی جیسے بس ابھی ابھی الٹیاں
شروع ہو جائیں گی۔

میں نے اپنے سر کو بار بار زمین پر پٹخا۔ اگر یہ کوئی منحوس خواب ہے تو اب اس خواب
کو ٹوٹ جانا چاہیے۔ مجھے اس کے شر سے چھوٹ جانا چاہیے۔ میں نے بے تحاشہ اپنی آنکھیں
رگڑیں۔ کیسا دہشت ناک خواب ہے۔ کتنا کرب ناک۔ اذیت ناک۔ میں نے اپنی بیوی بچوں کو پکارا
لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ زور لگا کر میں نے پھر آواز دی تو ٹرک میں لاشیں بھرتے ہوئے لوگ
دوڑ کر میری طرف آئے۔ میں نے اپنی رہی سہی پوری طاقت جمع کی اور اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا
بھاگتا۔ بھاگتا رہا۔ مجھے اپنی زندگی عزیز تھی۔ میں ایک نوجوان عورت کا شوہر دو معصوم
بچوں کا باپ تھا۔ مجھے اپنے علاوہ ان تینوں سے بھی بے حد پیار تھا۔ گرتا پڑتا لڑکھڑاتا
میں جوں توں اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا تو شدت خوف سے پتھر بن کر رہ گیا۔ کیونکہ
وہ عفریت پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اس کے جبڑوں سے خون ٹپک رہا تھا اور اس کے
ہاتھوں میں میرے دونوں معصوم بچے جنہیں میں ہنستا کھیلتا حرکت کرتا ہوا چھوڑ کر گیا تھا اب
بے حس و حرکت مردہ تھے۔ اس کی ٹانگوں میں پھنسی ہوئی میری بیوی جس کی بے نور ابلی ہوئی
آنکھوں میں دہشت زدہ تصویر ثبت تھی۔ جس کے نیم وا ہونٹوں پر منجمد چیخیں تھیں جیسے آواز
پانے سے پہلے ہی ان کا خاتمہ کر دیا گیا ہو۔ میری بیوی کا زخمی بدن لباس کی بجائے جگہ جگہ
ناخنوں سے کھرونچا ہوا آلودگی سے لتھڑا ہوا تھا۔ میں نے چاہا ان تینوں لاشوں کو پھلانگ کر
اُس مردود کا گلا دبوچ لوں مگر نفرت و نقاہت سے دب کر میرے سارے جسم نے مجھ سے بغاوت
کر دی۔ امید و بیم کی یہ بے سکت شکست مجھ میں دم توڑ گئی۔

یہی مدد کے لیے میں نہ جانے کون کون سے نام یاد کر کے پکارنے لگا۔ کون کون سے
رشتے یاد کر کے فریاد کرنے لگا۔ نہ جانے کس کس کی دہائی دینے لگا۔ بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ میں برباد
ہو چکا۔ میں مر رہا ہوں۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں انتقام لینا چاہتا ہوں۔ سب بچوں سب
بے گناہوں کا شدید انتقام۔ مگر میری آواز کا کسی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ کوئی مجھے

بچانے نہیں آیا۔ میں ایک بازگشت کی طرح اپنے ہی شکستہ گنبد میں چکرا تا رہ گیا۔ نامعلوم کب تک اس جلاد کی شیطانی مکروہ مسکراہٹ کی زد میں تڑپتا پھڑپھڑاتا رہا اور پھر بے ہوش ہوگیا۔

اس بار جب ہوش آیا تو اندھیرے کی بجائے اجالا دکھائی دیا اور جلے ہوئے گوشت کی سڑاند اور جمے ہوئے خون کی بساندھ کی بجائے مختلف دواؤں کا ملا جلا تیز بھبکا میرے نتھنوں سے گذرتا ہوا دماغ تک پہنچا۔ اجالے کی ہمت اور ہمدرد آوازوں کی غمگساری سے جرأت پا کر میں نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور پھر بچوں کو پکارنے لگا۔ اسی وقت ایک نرس لپک کر میرے قریب آئی اور ملائمت سے بولی۔

"مت چلاؤ، آرام کرو آرام۔ تمہیں آرام کی بہت ضرورت ہے"

"ڈاکٹر، ڈاکٹر۔ یہ ہوش میں آرہا ہے۔ کچھ کہہ رہا ہے"۔ نرس سے یہ سن کر ایک تیز چاپ ابھری اور بالکل میرے نزدیک آکر تھم گئی۔ آنے والے نے آہستگی سے میری نبض تھامی، میرے دل کی دھڑکن محسوس کی، میری پیشانی چھوئی اور کوئی چیز میرے منہ سے لگا دی جسے نرس کی مدد سے ذرا سی گردن اٹھا کر میں غٹاغٹ پی گیا۔ دفعتاً مجھے اپنے آپ میں توانائی آتی محسوس ہوئی۔ پنے جلتے سلگتے وجود میں تھوڑی راحت تھوڑی ٹھنڈک معلوم ہوئی تبھی نرس نے میرے بازو میں سوئی چبھو دی جس سے آہستہ آہستہ میری آنکھیں بوجھل ہونے لگیں اور میری ڈوبتی ہوئی سماعت نے ڈاکٹر کی یہ آواز سنی۔

"سے سونے دو۔ جتنا زیادہ آرام ملے بہتر ہوگا" اور یہ سنتے سنتے پھر میں خود سے بیگانہ نہ جانے کس اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگا۔

کافی عرصے تک یہی کچھ ہوتا رہا۔

میں جاگتا۔ مجھے کچھ کھلا پلا دیا جاتا۔ ضرورت سے فارغ کروا دیا جاتا۔ مجھے سلا دیا جاتا۔ اس عرصے کا کوئی صحیح اندازہ نہیں لیکن جب بتدریج نقاہت کم ہونے لگی اور میں نارمل حالت میں واپس آنے لگا تو ایک روز میں ایکا ایکی چلایا۔

"یہ کیا مذاق ہے یہ میرا گھر نہیں میرا بستر نہیں۔ یہاں کوئی میرا نہیں۔ میں یہاں کیوں

لایا گیا ہوں۔ کیا میں بیمار ہوں، بیمار۔؟" میں نرس کو گھورنے لگا۔

"اب آپ ٹھیک ہو رہے ہیں" نرس نے کہا۔

"کیا ہوا تھا مجھے۔؟"

"آپ کافی بیمار رہے ہیں"

"ہا ہا ہا" میں ہنسا "اس کا مطلب ہے کل آپ یہ کہیں گی کہ میں صحیح الدماغ نہیں تو کیا میں پاگل کہلاؤں گا!"

نرس نے کچھ نہ کہا۔

"سنیئے میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ میرا نام کمال ہے۔ میں ایک بے حد مشہور و مقبول کمرشیل فرم کا منیجر ہوں اور اپنے افراد خاندان کے ساتھ مسرور و معقول زندگی گذار رہا ہوں میں... میں....." دفعتاً میری یادداشت الجھنے لگی۔ میں سٹپٹایا۔ کچھ چیخیں میرے ذہن میں گونجیں۔ جلے ہوئے گوشت کی سڑاند اور جمے ہوئے خون کی بساندھ میرے نتھنوں میں ابھری اور میں نے رک رک کر ہچکچا کر کہا۔

"میں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا تھا نرس۔ اور اسی سے ڈر کر شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا"

"ہاں ایسا ہی ہوا تھا۔ حالتِ خوف میں آپ اپنے بستر سے گر پڑے تھے۔ آپ کے سر میں چوٹ آئی تھی لیکن اب آپ روبہ صحت ہو رہے ہیں اس لیے کسی پریشانی کسی خوف و ہراس کو اپنے ذہن میں جگہ نہ دیں۔ اب آپ خطرے سے محفوظ ہیں۔ ممکنہ آرام لیں اور پرسکون رہیں کیونکہ اسی طرح آپ مکمل صحتمند ہو سکتے اور اسپتال سے اپنے گھر جا سکتے ہیں"

میں نے برہمی سے نرس کو دیکھا۔ میرا جی چاہا اسے دھکیل کر بھاگ لوں۔ فوراً اپنے گھر پہنچوں، اپنی بیوی اور بچوں کو گلے لگاؤں۔ اپنی مطمئن اور مسرور زندگی ہمیشہ کے مطابق گذاروں مگر میں نے اپنے اندر دبے ہوئے اندرونی غصّے، جوش، کوفت اور تمام خواہشات کو اپنے اندر روکا ضبط کیا۔ پہلے مجھے اپنی حالت ٹھیک طرح سمجھ لینی چاہیئے

میں نے سوچا اور جھوٹی ملائمت سے نرمی سے بولا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں" اتنا کہہ کر میں نے سختی سے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ خوب سویا اور جب جاگا تو اس مرتبہ ہسپتال کے مخصوص وارڈ کی بجائے ایک نئے مکان میں بالکل ہی نئے لوگوں کے ساتھ تھا۔

یہ کافی کشادہ مکان ہرے بھرے باغیچے کے ساتھ ملحق تھا۔ اس کے لمبے لمبے ہال نما کمرے ہوا اور روشنی سے بھرے ہوئے تھے۔ کئی لوگ اپنی اپنی مختلف دلچسپیوں میں مصروف تھے مگر سب کے چہرے پرچھائیوں جیسے تھے۔ کسی کے خدوخال حقیقی نہیں محسوس ہوتے تھے۔ خود سے بے گانہ نہ جانے کن کن سوچوں اور خیالوں میں گم۔

کیا یہ بھی میرے بے سروپا خواب ہی کا کوئی حصہ ہے۔ میں نے آنکھیں مل مل کر غور کیا۔ میں بیشک ہسپتال میں نہیں تھا لیکن جہاں اب تھا یہ بھی میرا گھر نہیں تھا۔ یہاں بھی دور و نزدیک میرا کوئی نہیں تھا تب۔؟

میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ ایک جانب سے ایک دلکش و دلآویز شخصیت والی خاتون میرے قریب آئیں اور بے حد خوش اخلاقی اور خوش مزاجی سے مخاطب ہوئیں۔

"خوش آمدید، یہ آپ کی نئی قیام گاہ ہے جناب۔ یہاں اور بہت سے لوگ ہیں، دل بہلانے کے بے حساب مشغلے۔ سب سے مل جل کر خوش بخوش رہیے۔ اپنی مرضی کے دوست بنایئے جس مشغلے سے دلچسپی ہو اس کے ساتھ خوش وقتی سے اپنا دن گذاریے۔ راتوں میں سکھ سے سویئے۔ آپ جب تک یہاں ہیں آپ کو کوئی دقت نہیں پیش آئے گی بلکہ سہولتیں ہی سہولتیں حاصل رہیں گی۔ اگر اتفاقاً کوئی دقت پیش آجائے تو یہ ناچیز آپ کی مدد اور خدمت کے لیے ہر وقت حاضر رہے گی۔ آپ جب چاہیں ہماری خدمات حاصل کر سکتے ہیں۔"

"شکریہ، لیکن آپ کون ہیں؟" میں نے اس خاتون سے پوچھا۔

"آپ کی دوست!" وہ بولی۔

"لیکن میں آپ کو نہیں پہچانتا!"

"پہچان جائیں گے، آہستہ آہستہ!"

" یہ بھی خوب رہی میں نے دل میں سوچا۔ جان نہ پہچان ہم آپ کے مہمان لیکن اس وقت تو میں ان نامعلوم لوگوں کا مہمان تھا جو مجھے استعفا دے کی توقعات باندھ رہے تھے۔ آگے کیا ہونے والا تھا کسے معلوم۔

"اور وہ دواخانہ..... ڈاکٹر.... نرس..... میرا علاج..... کیا میں بیمار نہیں تھا۔ کسی دواخانے میں نہ یہ علاج نہیں تھا۔ ؟؟"

" جناب ایسی باتیں مت کیجیے۔ آپ مشہور زمانہ "کاکاجی کمرشیل فرم" کے ذمے دار عہدے دار ہیں اور بہت جلد آپ کو دوبارہ اپنا کام سنبھالنا ہے۔ ایک حادثے نے آپ کو مجروح کر دیا تھا اس لیے آپ کو فرم کے اس تفریحی سینٹر میں لایا گیا ہے۔ تاکہ یہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد تازہ دم ہو کے پھر اپنے فرائض تندہی سے انجام دے سکیں۔ اس عارضی عرصے کو غم ناکی سے دور خوش دلی سے گذار دیجیے۔ اچھا فی الحال اجازت......"

وہ جس طرح آئی تھی اسی طرح واپس ہوئی۔ میں کبھی اس کی جاتی ہوئی پشت کو اور کبھی حیران ہکا بکا خود اپنے آپ کو دیکھتا رہا۔

ایک شخص جو اس تمام عرصے میں بڑے انہماک سے کیاریاں بنا بنا کر توڑ رہا تھا اس خاتون کے چلے جانے کے بعد اٹھ کر میرے پاس آیا اور بولا۔

" میرا نام کما ہے" اتنا کہہ کر وہ ذرا سا جھکا، مسکرایا اور ایک جانب غائب ہو گیا۔ یا الٰہی یہ کیا گورکھ دھندا ہے۔ عجیب گھن چکر۔ میں نے اپنی آنکھیں میچیں۔ مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ پاس سے گذرتے ہوئے ایک اور شخص کو روک کر میں نے پوچھا۔

" سنیے، کیا یہاں سے میں اپنے گھر اپنی بیوی کو خط بھیج سکتا ہوں؟"

" اپنا گھر" وہ شخص زور سے ہنسا پھر بولا۔

" بغر در بغر در "

اس کے مضحکہ خیز انداز کی وجہ سے مجھے اس سے مزید گفتگو کی خواہش نہ ہوئی۔ یہ ڈر بھی تھا۔ مزید کچھ ناقابل حل، ناقابل یقین اور کھٹے جواب نہ مل جائیں۔

یہ دماغی بیماروں کا پاگل خانہ تو نہیں۔؟ میں نے سہم کر سوچا۔ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اگر جیل خانے

والی فضا ہرگز ہرگز نہیں تھی یہاں ۔ اس لیے مزید غور و فکر ترک کرکے کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے میں
اپنی بیوی کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔ اس خاتون کے مطابق ضرورت کی تمام چیزیں دستیاب تھیں
یہاں اور بڑے ہال نما کمرے کے آخری کنارے پر ایک پوسٹ بکس بھی آویزاں تھا۔

خط بھجوا دینے کے بعد مجھے اپنی بیوی کے خط کے جواب کا شدید انتظار تھا لیکن میرے
کئی خطوں میں سے ایک کا بھی جواب اب تک نہیں آیا تھا۔

جب میں بیحد متفکر اور متوحش ہونے لگا تو کمار نے خلاف توقع میری ڈھارس بندھائی۔

"کیوں پریشان ہوتے ہو مت ہو۔ آجائے گا جواب"

میں نے شک سے کمار کی طرف دیکھا مگر اس کے چہرے پر خلوص تھا اور دور دور تک
کسی سازش کا شائبہ نہ تھا۔

اس اطمینان کے بعد میں نے کمار سے دریافت کیا۔

"تم کیاریاں بنا بنا کے توڑ کیوں رہے تھے اس روز ؟" کمار نے گھور کر مجھے دیکھا "تمہیں
مطلب" اس کا لہجہ بوجھل اور آواز مرتعش تھی۔

"کیا یہاں رہنے والے سب دوست نہیں ؟ - کچھ دشمن بھی ہیں - ؟" میں نے بے اعتباری
سے ادھر ادھر دیکھا۔

"نہ دوستی میں کچھ رکھا ہے نہ دشمنی میں۔ جب زندگی ہی ٹوٹ پھوٹ گئی تو اب
خوشی کیسی اور شکایت کیسی!"

اس کورے جواب سے میں پھر اپنے دل و دماغ پر پتھر رکھ کر ضبط کو اپنانے لگا اور
ایک ایک بدترین دن پوری بے کیفی سے گذر رہا تھا جس نے میرا اندرونی خوف اور ظاہری
خاموشی حد سے زیادہ بڑھا دی مگر سوالات بے فائدہ تھے کیونکہ ہر جواب نہایت ڈرامائی
محسوس ہوتا تھا جبکہ میں ڈرامے کے خاتمے کا از حد منتظر تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ حالات
سے مطمئن ہو سکوں، صحیح صحیح صورت حال دریافت کر سکوں مگر نہیں ہو سکا۔ اس تفریحی
سینٹر کے تمام لوگ بیک نظر اکھٹے نظر آتے تھے لیکن بغور مشاہدے سے علانیہ معلوم ہو جاتا
تھا کہ سب کے آپس میں بہت سرسری روابط ہیں۔ کوئی ایک دوسرے سے مربوط و وابستہ

نہیں۔ سب کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے۔ سب کی آپس میں یہ بات چیت بھی ہوتی تھی مگر کوئی بھی کسی سے اپنے شب و روز سے مطمئن نہ تھا حتیٰ کہ ایک روز کمار نے خود ہی پھر مجھے مخاطب کیا "کیا تم بہادر انسان ہو؟" میں نے بے دلی سے جواب دیا "کیوں نہیں"، کیونکہ میرا تمام ذہن اپنے گھر کی طرف لگا ہوا تھا۔

"کتنے بہادر ہو؟"

"جتنا ایک انسان ہو سکتا ہے؟"

"یعنی بری سے بری خبر بھی کیا ضبط و تحمل سے برداشت کر سکتے ہو؟"

"کیسی بری خبر۔؟" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھو، بیٹھو۔" کمار نے کہا "معلوم ہو گیا تم قطعی بہادر نہیں ہو۔"

"خدا کے لیے پہیلیاں نہ بجھاؤ کمار، صاف صاف بتلاؤ۔ میں معموں سے عاجز آ چکا ہوں میں نے التجائی انداز میں کمار سے درخواست کی۔

"فرض کرو تمھیں یہ اطلاع ملے کہ تمھارے گھر کو آگ لگ گئی ہے۔ تمھارا سب کچھ جل کر بھسم ہو چکا ہے تب۔؟ تب کیا کرو گے تم؟" وہ مجھے گھورتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

"لیکن کیوں، خواہ مخواہ کس نے لگائی آگ، میں تو کسی کا دشمن ہی نہ تھا۔ نہ ہی کوئی میرا دشمن ہے۔"

"پھر بھی اگر آگ لگ ہی گئی ہو تو۔؟" کمار میری مضطرب آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

"تو مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟" میں یکایک بچوں کی طرح بلکنے لگا۔ کوئی آواز نہ جانے مجھ سے کیا کیا کہنے لگی۔ ایک دم مجھے سب کچھ یاد آنے لگا۔

"سمجھا، اسی دیو، اسی عفریت نے جسے ضرور تم ہی نے بھجوایا ہو گا ورنہ تمھیں یہ سب کیسے معلوم ہوتا؟" میں متعجب انسان کی طرح چیخا اور لپک کر کمار کا گریبان پکڑ لیا۔

"اب میں تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا کمار، ہرگز نہیں چھوڑوں گا" یہ کہتے ہوئے سب کچھ واضح طور پر میری یادداشت میں ابھر آیا تو میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔

کمار نے جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑایا اور مجھے پرے دھکیل کر پھنکارا۔

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اس عفریت کو تم نے اکسایا یا تم نے شہہ دی ہو تم نے راہ دی ہو؟"
میں نے پہلے سہم کر پھر نفرت و برہمی سے کمار کو دیکھا۔
"یہ غلط ہے، یہ سراسر الزام ہے..... میں نے اپنی کنپٹیاں تھام لیں اور سسکنے لگا۔
"ہائے میری بیوی، میرے بچے۔ وہ سب لوگ جو میرے سامنے نوچے کھسوٹے جلائے اور قتل کیے گئے۔ آخر ان کا قصور کیا تھا..... کیا بے گناہی ہی ان کی خطا تھی؟"
کمار گھبرا گیا اپنی برہمی بھول کر اس نے دوستانہ انداز میں مجھے تھپکی دی۔
"معاف کرنا دوست! کبھی کبھی میں بھی وحشی ہو جاتا ہوں حالانکہ میں بہتری میں یقین رکھتا اور ہمیشہ سب کی بہتری کے لیے ہی کام کرتا رہا ہوں مگر اب حالات سے بہت مایوس ہو چکا ہوں اس بے رحم بدبخت نے بہت کچھ نگل لیا ہے۔ بہت سے لوگ ہماری طرح سنبھالا لینے کے لیے یہاں لائے گئے ہیں جن میں ہم بھی ہیں۔ ہم سب محض بہلائے جا رہے ہیں مگر کب تک؟ کوئی زندگی بھر تو نہیں بہل سکتا نا؟ بالآخر ہمیں اپنے زخموں کے ساتھ سمجھوتہ کرنا ہی پڑے گا۔" کمار آبدیدہ ہو گیا۔ اس کی مستحکم آواز۔ پرسکون لہجہ لڑکھڑا گیا۔ اس کی روشن آنکھیں دفعتاً سونی اور ویران اندھیری اندھیری نظر آنے لگیں جو خلاؤں میں تکے جا رہی تھیں۔ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔ اس کے اندرونی درد کو جان کر میں نے ملائمت سے اس کا ہاتھ تھاما تو میری بھیگی ہوئی آنکھوں اور پھڑپھڑاتے پھٹتے ہوئے دل کو بھی قدرے قرار اور ڈھارس محسوس ہوئی۔
"کیا ہم اس سے انتقام نہیں لے سکتے کمار۔؟ اسے مار نہیں سکتے۔؟"
"کاش ہم ایسا کر سکتے۔ دراصل اسے ختم کرنے کے لیے بڑے حوصلے اور حد سے زیادہ سمجھداری کی ضرورت ہے کمال۔ غیر معمولی قوت برداشت اور استقلال کی کیونکہ انسانی خون پیتے پیتے انسانی گوشت ادھیڑتے ادھیڑتے وہ عادی مجرم بن گیا ہے جو تھک تو جاتا ہے لیکن اپنی روش نہیں بدلتا۔ اپنی بدخوئی اور خونخواری نہیں چھوڑتا۔ آدمی کو آدمی کا دشمن بنانا اور دنیا کو میدان کارزار بنائے رکھنا ہی اس کا مقصد ہے۔"
"ہاں!" میں نے اعتراف کیا۔ "میں نے بھی ہر بار چاہا کہ موقع واردات پر ہی اسے

دبوچ لوں۔ اسے اس کے تمام ناپاک منصوبوں کے ساتھ منٹوں میں ختم کر دوں لیکن وہ اتنا خوفناک طاقتور خونخوار ہے کہ ہر بار میری ہمت جواب دے گئی۔ ہر بار میں بزدلوں کی طرح اس سے خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔" یہ کہتے کہتے بے تحاشہ پسینہ میری پیشانی پر ابھر آیا۔

"اور یہ سب صرف اس لیے کہ اس کے اپنے سمجھوتے اور مفادات ہیں دوست۔ جب تک ان سمجھوتوں اور مفادات کا خاتمہ نہیں ہوتا خود اس کا ختم ہونا ناممکن ہے!

"تو وہ مفادات اور سمجھوتے کس طرح ختم کیے جا سکتے ہیں کمار۔ تم اور میں یا مزید چند نفوس ایسا نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے بہت بڑے پیمانے پر یقین و اعتماد کی ضرورت ہے۔ سوچو تو نہ جانے کتنوں نے اس خبیث کے ہاتھوں میں اپنی ماؤں کے برہنہ جسم دیکھے مگر مر نہ سکے۔ اپنے بوڑھے باپوں کے ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھے مگر انہیں بچا نہ سکے۔ جانے کتنوں کے نوجوان بھائی بہن اس منحوس کے ہاتھوں گاجر مولی کی طرح چھیل دیے گئے مگر کوئی کچھ نہ کر سکا۔ مظلوموں کی چیخیں میرے اندر بھی زندہ ہیں کمال۔ اور جب جب کروٹ لیتی ہیں تو جی چاہتا ہے ساری دنیا کو ملیامیٹ خاکستر کر ڈالوں لیکن جب بھی اس غرض سے کوئی ہتھیار اٹھاتا ہوں تو میری آتما پوچھتی ہے۔ کیا تم بھی ان شیطانوں میں سے ہو جو دنیا میں نفرت و کدورت کا زہر پھیلانے، نفاق کے بیج بونے، موت کے تحفے بکھانے کے لیے پیدا ہوئے ہیں تب ہتھیار خود بخود میرے ارادے کے ہاتھ سے چھوٹ جاتے اور میں اپنی زبان بھول کر صرف سسک سسک کر زندہ رہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کمال۔

میں کیا کروں میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں"! یہ سن کر میں نے بے حد آہستگی سے کمار کو تھپتھپایا مجھے اسی لمحے معلوم ہوا کہ آنسو، زخم، عزت و ناموس۔ محبت و انسانیت کے الگ الگ مذہب نہیں ہوتے۔

درد کا، دوست کا، ایک اچھے انسان کا ہاتھ تھام لینے سے ہر کوئی زندگی کے قابل ہو جاتا ہے۔ خود اپنے آپ میں استحکام دردمندی سکون و یقین پاتا ہے تب اپنی تمام محرومی کو نظر انداز کر کے میں نے ایک نئے جوش و خروش نئے عزم سے کہا۔

"مت گھبراؤ کمار۔ ہمیں اپنا وطن، اپنے عزیز و اقربا اپنے پڑوسی، اپنے دوست

دجّال بھی موجود ہیں۔ وہ جس کسی نے اپنوں کو جلتے کٹتے دفن ہوتے دیکھا ہے۔ اپنوں کی آہ و بکا سنی ہے اپنوں کے خون میں نہایا ہے۔ اس عفریت کا یقینی دشمن ہے۔ وہ علی گڑھ، مرادآباد میرٹھ، بیانہ میں ہو کہ دہلی حیدرآباد یا احمدآباد میں۔ ہم تم ہی اسے مار سکتے فنا کر سکتے ہیں، میرے دوست! صرف ہم تم ہی!"

یہ سن کر کمار نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں اپنے ارادوں میں۔ الفاظ میں ہم یقیناً ایسا کر سکتے ہیں کمار لیکن عملاً ہرگز نہیں۔ یہی تو ہماری ٹریجڈی ہے دوست کہ ہماری زندگی بس یونہی منصوبے تیار کرتے پلان باندھتے گذر جائے گی۔ بس ایک دوسرے کی ڈھارس بندھاتے ہوئے۔ تبھی ہم کر بھی تو رہے ہیں۔"

میں نے اپنی اور کمار کی پژمردگی اور مایوسی کو نظرانداز کر کے ایک نئی اندرونی طاقت سے جتلایا۔

"میری بات غور سے سنو کمار۔ ہم ٹوٹے پھوٹے زخمی سہی مگر ہم نئی زندگی شروع کر سکتے نئے گھر بسا سکتے ہیں!"

"شش!" کمار بے دلی سے بولا۔ "بے کار کوشش ہے یہ سب محض بہلاوا ہے۔"

"نہیں۔ ہر ارادہ بہلاوا نہیں ہوتا کمار۔ کچھ عزم ایسے بھی ہوتے ہیں جو واماندگی کو نئی توانائی نیا پیراہن دیتے ہیں۔ نئی شخصیت اور میں اس وقت خود کو ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں تم بھی کر سکتے ہو اگر تلخ بے رحم حقیقتوں کے ساتھ ساتھ اٹل اور یقینی صداقتوں کو بھی تسلیم کر لو!"

کمار نے متذبذب انداز میں مجھے گھورا اور بے یقینی سے بولا۔

"کون سا ایسا نسخہ ایسا منصوبہ ہے تمہارے پاس جو ہمارے لہولہان محسوسات کو مندمل تندرست کر سکے۔ ہمارے جذبۂ انتقام ہماری بے بسی کو دور کر سکے۔ ہمیں باغی بننے سے روکے۔ ہمیں پھر سے ایک اچھا مطمئن انسان بنا دے۔ سناؤ۔ سناؤ ذرا۔ میں نے بھی بارہا یاسیت کو جھٹک کر باہمت بننے کی کوشش کی ہے مگر لگتا ہے اب میں کبھی ایک نارمل انسان نہیں بن سکوں گا۔ میرے ذہن میں ہمیشہ معصوموں کی چیخیں گونجتی رہیں گی۔ یہ زخم مجھے ہمیشہ انسانیت سے دور لے جاتے رہیں گے۔ صرف سفاکی کی یاد دلاتے مشتعل کرتے رہیں گے!

کمار تشنجی انداز میں اپنی مٹھیاں کسنے لگا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو کمار۔ ہمارے درد کا درماں ہمارے شدید زخموں کا کوئی علاج نہیں مگر سوچنے والی بات یہ ہے کہ ہم اجڑے ہوئے لوگ بے شک نئے گھر تو بنا سکتے ہیں، نئی زندگی بھی شروع کر سکتے ہیں لیکن کیا ہم نئی دنیا بھی بنا سکتے ہیں۔؟"

ہیں نا۔ تو دنیا کو ہنستا بستا رکھنے کے لیے آؤ ایک معاہدہ کریں۔

اٹل ارادے اور ایمانداری سے ہاتھ ملائیں اور یہ تہیہ کریں کہ خواہ کچھ ہو جائے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ کسی حالت میں نہ چھوڑیں گے۔ ایک دوسرے کے احترام اور خلوص کو کبھی چیلنج نہ کریں گے۔ کبھی ایک دوسرے پر شک نہ کریں گے تب کون ایسا ہوگا دوست۔ جو ہمیں ہرا سکے۔ نیچا دکھا سکے ہمیں کوئی گزند نہ پہنچا سکے۔؟ سوچو کمار سوچو.....

کمار نے نگاہ جما کے پہلے مصافحے کے لیے اس کی طرف بڑھتے ہوئے میرے ہاتھ کو دیکھا پھر کرسی کے ہتھے پر رکھے ہوتے خود اپنے ہاتھ کو تب اس نے تجسس بے قرار آنکھیں میری مضطرب آنکھوں میں ڈالیں جیسے سچائی کو ٹٹولنا چاہتا ہو پھر کوندے کی سرعت سے میری طرف لپکا اور منٹوں میں ہم دونوں بغلگیر ہو گئے

ہم دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے جن میں خود ہماری، اور دوسری تمام انسانی بربادیاں ابھر ابھر کر ڈوب رہی تھیں مگر وہ بے پایاں خوشی، وہ ہنسی وہ "عہد" جو ہمارے پیمان کے لبوں پر تھا۔ ہمارے آنسوؤں پر ہمیشہ اس دنیا کی طرف دیکھ رہا تھا جو ہماری ضرورت تھی۔

طواف

"چپس ناظرہ امبیاں توڑیں" جب وکیلہ نے ناظرہ کو اکسایا تو اپنا میلا پیوند لگا دوپٹہ بے حد شان سے اپنی سوکھی ماری کمر کے گرد کس کر ناظرہ فوراً وکیلہ کے ساتھ چل پڑی۔
"چاہے کچھ بھی الابلا کھالو مگر امبیوں کا اپنا ایک ذائقہ ہوتا ہے سب سے علیحدہ سب سے مزے دار۔ ہے نا وکیلہ۔؟"
"اور کیا" تب بڑے آرام سے آم کے پیڑ کی سب سے لدی پھندی شاخ پر پہنچ کر دونوں بالکل طوطوں کی طرح کچی کچی امبیاں کتر کتر کر کھانے لگیں۔
وکیلہ ناظرہ سے زیادہ چالاک تھی لہٰذا گھر سے نکلتے ہوئے اس نے اپنے ملگجے دوپٹے کے پلو میں حسب ضرورت نمک بھی باندھ لیا تھا۔ ویسے تو ہرا امبی کے یہ نمک کی ضرورت نہیں ہوتی تھی مگر تو امبی زیادہ ترش ہوتی س پر نمک چھڑک دینے سے ترشی بھی کم ہو جاتی در گلا بھی نہ کھرکھراتا۔
باغیچے کے بوڑھے ماں نے ن دونوں کو امبیاں توڑتے اور کھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا لیکن جب سے اس کی نوجوان لڑکی درخت سے گر کر ایک ٹانگ توڑ بیٹھی اور ہمیشہ کے لیے اپاہج ہو گئی تھی۔ اس نے ان لڑکیوں پر غصہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ امبیوں کی تو قین ان نوعمر بچیوں سے صاف آنکھ بچا جاتا۔ کیونکہ یہ اس کی لڑکی کی سہیلیاں تھیں زیادہ سے زیادہ کتنی امبیاں کھائیں گی۔ اس میں ایسا کون سا نقصان تھا۔ اتنی اتنی امبیاں تو ہر روز پرندے ہی

کے ڈنڈے تھے لہٰذا وہ انجان بنا عمداً دوسری سمت چل دیتا۔

باغیچہ تھا شاندار۔ اگر اس سے ملحق جھگی جھونپڑیاں اور سرونٹ کوارٹرز نہ ہوتے تو یقیناً باغیچہ زیادہ محفوظ رہتا مگر جھگی جھونپڑیوں کے بچے کچے پکے آموں کا کافی نقصان کرتے وہیں باغیچے کو دوسروں سے محفوظ بھی رکھتے اور کسی نئے آدمی کو باغیچے میں قدم نہ دھرنے دیتے۔

تو جب جی بھر امبیاں کھا کر وکیلہ اور ناظرہ واپس ہوئیں تو وکیلہ سیدھے اپنے کوارٹر میں چلی گئی اور ناظرہ کھانے سے بچی امبیاں اپنے پلو میں باندھ انھیں احتیاط سے سنبھالے اپنے کوارٹر پہنچ لی۔

کوارٹر سے متصل مٹھی بھر صحن میں داخل ہوتے ہی کیچڑ بھری زمین پر ایک چوکور پتھر جمائے اس پر اکڑوں بیٹھی کپڑے دھوتی ہوئی ناظرہ کی ماں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور پوچھا۔

"کہاں گئی تھی۔؟"

ایک سکنڈ کے لیے ناظرہ نے سوچا ماں کو جھکیہ دے دے مگر اس کے اس ارادے سے قبل ہی ماں ناظرہ کے پلو میں بندھی امبیوں کو تاڑ چکی تھی۔

"کتنی بار سمجھایا ہے تجھے کہ چوری نہیں کرتے مگر تیری سمجھ میں نہیں آتا، کسی دن پکڑی گئی نا تو یاد رکھ لینا میں بچانے نہیں آؤں گی اور اتنی پٹائی ہوگی کہ امبیوں کا تمام ذائقہ بھول جائے گی تو۔ باغیچوں کے مالی بڑے بے رحم ہوتے ہیں ری۔" ماں کی بات سن کر گھبرانے کی بجائے ناظرہ مسکرائی۔

"ہمیں تو کوئی کچھ نہیں کہتا ماں۔"

"کیوں اس باغیچے کا کوئی رکھوالا نہیں ہے کیا؟"

"ہے تو بے شک مگر جانے کہاں کھسکا رہتا ہے۔ کم ہی نظر آتا ہے۔ باغیچہ بہت بڑا بھی تو ہے اماں۔"

"تو کیا ہوا رکھوالا دیکھے نہ دیکھے ایمانداری پر خوش ہو نہ ہو خطا قصور پر سزا دے نہ دے خدا تو سب کچھ دیکھتا اور تولتا ہے نا۔"

"اونہوں۔ وہاں دور دور تک خدا بھی نہیں ہوتا اماں۔" ناظرہ نے سو فیصد یقین سے کہا۔

تو کپڑے پٹکنا چھوڑ کر ناظرہ کی ماں اٹھی اور ناظرہ کے دو دھپ جمائے۔

"خدا ہر جگہ ہوتا ہے کمبخت۔ خود تیرے اندر موجود ہے خدا۔ تیرے اعمال تولتا ہے۔"

پلو میں بندھی ہوئی املیوں پر ناظرہ کی گرفت ایکدم ڈھیلی ہوئی تو پلو سے چھوٹ کر املیاں ناظرہ کے قدموں میں بکھر گئیں۔

"کیا سچ اماں...؟" ناظرہ نے بے یقینی سے پوچھا۔ "تم مجھے دھمکا تو نہیں رہی ہو؟"

"سمجھا رہی ہوں تجھے کہ انسان سے ڈر مت ڈر خدا کا خوف ضروری ہے ورنہ......"

"بس کر" ناظرہ نے صحن کی مٹی میں بکھری ہوئی املیاں نہیں اٹھائیں بلکہ چپکے سے کوارٹر کی دالان کوٹھری میں جا کر خود کو اچھی طرح ٹٹولا۔ جانے مجھ میں کہاں چھپا ہوا ہے خدا؟ لیکن کافی ڈھونڈنے پر بھی اسے خدا نہیں ملا تو ناچار کوٹھریا سے باہر آ کر وہ پھر سے ماں سے لپٹ گئی۔ کام کرتے کرتے اس نے سوال داغا۔

"اماں میں نے کوٹھریا میں جا کر خود میں بہت ڈھونڈا اماں پر خدا مجھے ملا ہی نہیں۔"

"ہائے" ماں نے اپنے گیلے جھاگ بھرے ہاتھوں سے اپنا ماتھا پیٹا۔ "کتنی پگلی ہے تو ری بٹیا، ارے سمجھ تو جیسے چھو کر ہی نہیں گئی ہے تجھے۔ ارے خدا کسی کو نظر تھوڑی آتا ہے خدا بس محسوس ہوتا ہے۔ چل چل کام شروع کر کسی نہ کسی دن تجھ کو سمجھ آ جائے گی تو بھی۔"

تو کیا واقعی خدا کے ڈر سے املیاں چرانا چھوڑ دینے کی وہ...؟ یہی سوچ رہی تھی ناظرہ کہ اس کی ماں نے مٹی میں سنی ہوئی املیاں اٹھا کر کوڑے کے ڈبے میں پھینک دیں اور ہاتھ دھو کر دھلے ہوئے کپڑے ڈوری پر پھیلانے لگی۔ کپڑے پھیلاتے پھیلاتے ماں کی نظر ناظرہ کے متفکر چہرے پر پڑی تو ماں نے کسی قدر ملائمیت سے کہا۔

"خدا تو بندے کے دل و دماغ میں رہتا ہے بٹیا۔ خدا کو یہاں وہاں نہیں ڈھونڈنا چاہیے۔"

"تو پھر ابا خدا کو سجدہ کرنے مسجد میں کیوں جاتے ہیں اماں...؟" اسکول سے نابلد ناظرہ پکے وکیلوں کی طرح جرح کرنے لگی۔

"کیونکہ مسجد خدا کا گھر ہے اس لیے۔"

"لیکن ابھی تو تم نے کہا کہ خدا دل و دماغ میں رہتا ہے پھر مسجد میں کیسے آ گیا خدا..."

" زیادہ ٹر ٹر مت کر۔ خدا جہاں چاہے رہے۔ جب پوری دنیا اسی نے بنائی ہے تو کیا تمام دنیا اسی کی نہ ہوئی ۔" لیکن خدا کا ہر جگہ موجود ہونا ناظرہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اونہہ !۔ اماں خواہ مخواہ خوفزدہ کر رہی ہیں مجھے ۔ وہ صفائی ختم کر کے چاول کی تھالی اٹھا لائی ۔ موئے دوکاندار کتنے کنکر ملا دیتے ہیں چاولوں میں تو پھر خدا ان کے نصیبوں میں بھی اتنے ہی کنکریٹ مل کیوں نہیں کر دیتا۔ مزے سے رہتے ہیں نامراد۔ مصیبت تو ہماری ہے کر بیٹھے بیٹھے ہاتھ دکھ جاتے ہیں ۔ چاول دھو کر جب وہ چولہے پر رکھ رہی تھی تو اماں نے مزید سمجھایا کہ "اچھے انسانوں کی بستی بھی مسجد جیسی ہوتی ہے جہاں ناپاکی نہیں ہوتی، جہاں ہمیشہ روشنی اور رحمت برقرار رہتی ہے۔

" اور بُرے انسانوں کی بستی کیسی اماں ۔؟" ناظرہ نے فوراً سوال جھاڑا۔

" دوزخ ہوتی ہے ۔ مقتل ۔"

" مقتل کیا ہوتا ہے اماں ۔"

" جہاں ہمیشہ مار کاٹ خون خرابہ برپا رہتا ہے ۔"

" ہائے ۔" ناظرہ لرزی " تو کیا واقعی انسان انسان کو مارتا کاٹتا ہے ۔؟ خدا بچائے ....."

" خدا کا خوف ہی انسان کو برائیوں سے بچاتا ہے اس لیے خوفِ خدا ضروری ۔"

اماں نے اسے متاثر دیکھ کر اسے لقمہ دیا اور چاول پکاتے پکاتے ناظرہ نے جھک کر اپنے گریبان میں جھانکا ۔ اتنی چھوٹی سی جگہ میں خدا کس طرح رہ سکتا ہے بھلا ۔ خیر جس طرح بھی رہتا ہے رہ لے مگر یہ احساس کہ خدا خود اس کے اندر موجود ہے ناظرہ کو یقیناً بوکھلا گیا جب وہ پاخانے غسل خانے میں ہوتی ہے کیا تب بھی ۔؟ تھو تھو تھو ۔!!! خدا کو باہر نکال کر ہی وہ پہلے جیسی چنچل اور ہلکی پھلکی ہو سکتی ہے ۔ مگر خدا کو خود سے باہر نکالنے کی کوئی ترکیب ہی اسے معلوم نہیں تھی نہ اماں سے پوچھنے کی ہمت ہوئی لہٰذا اپنی شوخی بھول کر ناظرہ جیسے ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور اگلے ہی روز حسبِ دستور جب وکیلہ نے پھر اسے ترغیب دی کہ چل امبیاں توڑیں تو وکیلہ کو اپنی کوٹھری میں لے جا کر اس نے اماں کی کہی ہوئی تمام بات سنا دی جسے سن کر وکیلہ ٹھٹھے مارنے لگی ۔

"ارے اتنے بڑے آسمان کو چھوڑ کر خدا ہمارے اتنے چھوٹے دلوں میں کیوں رہنے لگا بھلا۔ خالہ نے بے وقوف بنایا ہے تجھے اب چل دھوپ تیز ہو جائے گی پھر"
وکیلہ کے اصرار پر ناظرہ اس کے ساتھ چلی تو گئی مگر نہ اس نے امبیاں توڑیں نہ وکیلہ کی کوئی مدد کی۔ چپ چاپ پیڑ کے تنے سے ٹکی صاف شفاف بے محابا آسمان کو تکتی جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ بہت پکارا وکیلہ نے مگر وکیلہ کا کہا پانی کی لکیر بن گیا۔ ناظرہ کے ذہن میں امبیوں کا ذائقہ ہی ایک دم ختم ہو گیا۔ امبیاں کھانے کو اس کا دل ہی نہ چاہا۔
یہ تو کم عمری کی بات تھی مگر جب ناظرہ نے عمر کی کئی گلی منزلیں بتدریج پھلانگ لیں تو ایک روز بجائے وکیلہ کے اس کے دوسرے پڑوسی نذیر نے بازار جاتی ہوئی ناظرہ کو اچانک آ لیا۔ پہلے تو ناظرہ اطمینان سے چلتی رہی پھر اس احساس سے کہ نذیر برابر اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے نہ رک رہا ہے نہ آگے بڑھ رہا ہے، ناظرہ کی چال میں اپنے آپ فرق آ گیا "کیا ہے رے نذیر" ناظرہ نے بالکل اپنی ماں کی طرح ٹھسّے سے کہا۔
"اپنا راستہ لیتا کیوں نہیں"
نذیر مسکرایا۔ ناظرہ نے کچھ نہ سمجھ کر پوچھا۔
"کیا کوئی کام ہے مجھ سے"
"نہیں"
"تو پھر میرے ساتھ ساتھ کیوں چل رہا ہے۔ دفع ہو جا فوراً"
"کام تو کوئی نہیں ناظرہ صرف ایک بات کہنی ہے تجھ سے"
"تو کہہ ڈال اور رفوچکر ہو جا۔ گر میری ماں کو تیری حرکت کا پتہ چل گیا تو سمجھ لے تیری چھٹی ہو جائے گی"
"معلوم ہے مجھے۔ خالہ بڑی غصیلی ہے مگر......"
"اوہ" ناظرہ نے زچ ہو کر نذیر کو گھورا۔
"اب بکتا بھی ہے کچھ یا مچاؤں شور"
"نہیں نہیں۔ شور مت مچائیو ناظرہ ایک وعدہ کر لے مجھ سے"

"وعدہ۔؟" ناظرہ حیران ہکا بکا رہ گئی۔ "ارے کیسا وعدہ؟ کوئی تو نے میرے ساتھ جینے مرنے کا ارادہ کیا ہے جو وعدے قسمیں لے رہا ہے"

"یہی تو بات ہے ساری"

"کیا ہے۔؟" ناظرہ نے آنکھیں پھاڑیں۔

"خدا کی قسم تو مجھے بہت بھائے ہے ری ناظرہ۔

یہ سنتے ہی ناظرہ کی عقل کے طوطے اڑ گئے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ نذیر کو پھٹکارے یا شرما جائے چنانچہ بغیر کچھ کہے تیز تیز قدم اٹھا کر وہ بازار کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں سودا سبزی لیتے ہوئے ناظرہ کے ہاتھ بار بار کپکپاتے رہے۔

"کیا طبیعت ٹھیک نہیں ہے بیٹی؟" اس کے ہاتھوں کی لرزش محسوس کر کے رحیم چچا نے دریافت کیا۔

"تھوڑا جی ٹوٹ رہا ہے چچا بس سودا اماں کو تھما کر آرام کروں گی"

"تو یہ لے سبزی ترکاری اور جلدی سے گھر پہنچ جا۔" رحیم چچا نے جلدی جلدی اس کی مطلوبہ چیزیں اسے تھما دیں تو اپنا بے رنگ جھولا اٹھائے اٹھائے ناظرہ گھر پہنچ لی۔ ماں کو چیزیں تھماتے ہوئے بولی۔

"سر میں درد ہو رہا ہے اماں تھوڑا آرام کروں" ناظرہ نہیں چاہتی تھی ماں اس کی کیفیت کو سمجھ لے۔

"کر لے کر لے تھوڑی دیر آرام کر لے" ماں کی اجازت پا کر ناظرہ نے تکیے پر سر رکھا تو ریل کے انجن کی طرح سرپٹ اپنے دل کی بے تحاشہ دھڑکن کو اس نے پہلی بار علانیہ محسوس کیا۔

"تو مجھے بہت بھائے ہے ری ناظرہ"

جیسے تمام کوٹھری گھوم گھوم کر ناظرہ سے یہی کہہ رہی تھی۔ اب تک کسی نے بھی اس کو اتنی اہمیت کہاں دی تھی لہٰذا اس ایک جملے کی گونج رہ رہ کر ناظرہ کے تمام اندرون میں گونجنے لگی اور ہمک ہمک کر ناظرہ کو تھپکنے لگی۔ کہاں تو کسی کی ذرا سی ٹیڑھی نظر پر ناظرہ

فوراً جوتی چپل تک پہنچ جاتی تھی اور اب کہاں یہی یک بات اس کی تمام جان بن گئی تھی۔
کیا پیار کا ایک ہی بول اتنا میٹھا اتنا رسیلا، اتنا پُر اثر ہوتا ہے۔؟
کیا پیار کوئی جادو ہے؟۔
کیا پیار اتنی بڑی طاقت ہے کہ خود پر قبضہ کرے اور خود اپنے کو بچا نہ سکے....؟
وہ دوپٹے سے منہ ڈھکے دیر تک فقط یہی سوچتی رہی پھر ناچار اٹھ کر سر جھکائے جھکائے ماں کا ہاتھ بٹانے میں لگ کر کام کرتے ہوئے اس وقت اس کی شعوری کوشش یہی رہی کہ ماں اس کی کیفیت تک نہ پہنچنے پائے حالانکہ توے پر سنکتی ہوئی ہر روٹی نذیر کا چہرہ بن کر بار بار اس سے کہہ رہی تھی۔
"تو مجھے بہت بھاتی ہے ناظرہ، بہت بھاتی ہے۔"
اس روز ناظرہ نے روزمرہ کے تمام کام بڑی بے دلی سے کیے اور ماں نے اس کی طبیعت کی ناسازی کے باعث اسے بخش دیا۔
اگلے روز بازار جاتے ہوئے ناظرہ کا دل ہمکتا اور قدم رک رک کر اٹھتے رہے۔ مگر اس روز نذیر نے اس کا پیچھا نہیں کیا اور نذیر کی گونجتی آواز قدرے دب گئی۔ تو ناظرہ نے کسی قدر بے فکر ہو کر جلدی جلدی سودا لیا اور گھر پہنچ کر دلجمعی کے ساتھ کام نپٹائے تو اماں تعریفی نظروں سے اسے دیکھتی اور سراہتی رہی۔ مگر سہ پہر کو جب اماں وکیلہ کی ماں کے ساتھ کچھ دیر کے لیے گھر سے باہر گئی تو اچانک ہی نذیر آگیا۔ ناظرہ سٹپٹا کے رہ گئی۔
"یہ لے" نذیر نے اس کے ہاتھ میں جانے کیا تھمایا اور الٹے قدموں بھاگ لیا اس کے چلے جانے کے بعد بھی بڑی دیر تک ناظرہ نے اپنی مٹھی نہ کھولی مگر پھر آہستہ آہستہ ہمت کر کے ناظرہ نے اپنی مٹھی کھول دی تو پیلے کاغذ میں سرخ نگینوں کے دو بُندے ناظرہ کی ہتھیلی پر جگمگانے لگے۔ خوشی کی ایک تیز لاشعوری لہر ناظرہ کے تمام وجود میں تہلکہ مچا گئی اور اگلے ہی لمحے ناظرہ نے اپنی مٹھی پھر کس کے بند کر لی۔ کیا وہ ان بندوں کو نذیر کو واپس لوٹا دے۔؟ اگر نہیں تو کہاں چھپائے۔؟ اماں نے دیکھ لیا تو آفت

بچا ڈالے گی .... جلدی جلدی سارے گھر میں گھوم گر وہ کسی محفوظ جگہ کی تلاش کرتی رہی مگر کون ایسی جگہ تھی جہاں اماں کا ہاتھ نہ پہنچتا ہو۔ پھر بھی آخر کار ایک جگہ اسے مل ہی گئی۔ اپنے تکیے کے دو ٹانکے ادھیڑ کر ناظرہ نے وہ دونوں جگمگاتے بُندے معہ چھلے کاغذ کے روئی میں دبا دیے اور جھٹ ادھڑے ہوئے ٹانکے دوبارہ سی کر تکیہ اپنے سرہانے رکھ لیا لیکن اتنا سا کام کرتے ہوتے بھی ناظرہ کا دل دھواں دھواں ہو گیا۔ پھر تو وہ تکیہ ناظرہ کو جان سے عزیز ہو گیا۔ چند روز تک ماں نے غور نہیں کیا مگر ایک روز وہ پوچھ ہی بیٹھی۔

"کیا ہوا ہے ناظرہ تو اتنی گم صم کیوں ہو گئی ہے"

"نہیں تو اماں" ناظرہ صاف مکری۔

"نہیں کیسے۔ ایسی اٹ پٹی تو تو بڑوں میں ملتے وقت بھی نہ ہوئی تھی، پھر۔؟"

"کیا معلوم اماں"

"چل حکیم صاحب کو دکھاتی ہوں تجھے۔؟"

"ارے نہیں اماں ایسا کچھ بھی نہیں مجھے تو بس ایک ہی فکر ہے" اس نے مکاری کی۔

"فکر۔؟ کاہے کی کیسی فکر؟"

"شکیلہ سلائی سیکھنے سلائی سینٹر جاتی ہے نا اماں۔ تم نے دیکھا وہ کیسے خوبصورت گل بوٹے بناتی ہے ریشم کے"

"ہاں" ناظرہ کی ماں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تو پھر"

"میرا بھی دل کرتا ہے اماں کہ سلائی سینٹر جا کر ریشم کے ویسے ہی گل بوٹے بنانا سیکھوں"

"اچھا اچھا میں تیرے باپ سے پوچھوں گی اگر اجازت مل گئی تو تو شکیلہ کے ساتھ ہی چلی جانا"

پھر ماں ناظرہ کے مرجھائے پن سے ذرا بے فکر ہو گئی اور ناظرہ یہ سوچ کر مطمئن کہ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ماں کو نذیر تک پہنچنے ہی نہیں دیا، سلائی سینٹر میں الجھا لیا۔ ناظرہ کو یقین تھا اس کا باپ اسے کبھی سلائی سینٹر جانے کی اجازت نہیں دے گا اور وہ اسی فکر کے بہانے ماں کو ممکنہ حد تک نذیر سے دور رکھے گی۔ ناظرہ کا اندازہ درست ثابت ہوا

جب ماں نے ناظرہ کی خواہش کا ذکر اس کے باپ سے کیا تو وہ ناک بھوں چڑھا کر بولا: "لڑکیوں کو زیادہ خواہشیں زیب نہیں دیتیں ناظرہ سے کہہ دو خاموشی سے زندگی گذارے ورنہ......"

یہ سن کر ناظرہ کی ماں کو بیٹی کی طرفداری میں غصہ تو بہت آیا مگر وہ اپنے غصّے کے اظہار پر قادر ہی کہاں تھی۔ دلہنا پے سے لے کر اب تک اپنے سخت گیر شوہر کے احکامات ہی بجالاتی رہی تھی۔ تھوڑی بہت من مانیاں اور خواہشیں جو اس نے کیں تھیں انھیں اپنے ماں باپ کے گھر ہی چھوڑ آئی تھی چنانچہ اپنے غصّے کو ضبط کر کے اس نے ناظرہ کو یہ بات یوں بتلائی جیسے کوئی پہیلی سنا رہی ہو کیونکہ خود کو مغموم ظاہر کر کے وہ ناظرہ کی ہمت توڑنا نہ چاہتی تھی مگر دھماکہ تو اس وقت ہوا جب ناظرہ اپنے حکمراں باپ اور تجربہ کار ماں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نہایت رازداری سے ایک رات نذیر کے ساتھ روانہ ہوگئی اس کا باپ یقیناً دنوں چنگھاڑتا رہا ہوگا اور ماں نے خوب ہائے واویلا مچایا ہوگا مگر نذیر کے ہمراہ اس وقت ناظرہ کو ان دونوں کے احساسات کا مطلق احساس نہ ہوا اور نذیر ناظرہ کو لے کر اپنے ایک دوست کے پاس پہنچا جو میلوں دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں ازلی اکیلا مقامی ریلوے کا چھوٹا سا ملازم تھا۔ جو اکیلا ہونے کے باوجود اپنے کام اور زندگی سے نالاں نہیں تھا۔ وہ پیدائشی لاوارث تھا اور اپنی بابت جانتا تھا کہ میونسپلٹی والوں نے اسے ایک گندے نالے سے اٹھا کر تحقیقات میں لاوارث ثابت کر کے یتیم خانہ بھجوا دیا تھا۔ جہاں کبھی اسے کسی نے نہیں بتایا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ وہ ہر جگہ ننھے کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس پیے اس کی پہلی خوبی دردمندی اور دوسری خوبی قوتِ برداشت تھی۔ دونوں اس موقع پر بہت کام آئے۔ ساری بات جان کر اس نے نذیر اور ناظرہ کا کھلے دل سے استقبال کیا اور اپنی واحد تنگ و تاریک کوٹھری بے حد فراخدلی کے ساتھ دونوں کے حوالے کر دی کہ جب تک چاہیں اسے اپنا ہی گھر سمجھیں اور اس کے ہوتے کسی بات کی بالکل پروا نہ کریں۔

اپنی عمر کے اعتبار سے نہ نذیر نے نہ ہی ناظرہ نے اپنی اتنی بڑی جسارت کے متعلق کچھ سوچا بلکہ خوش بخوش اطمینان اور طمانیت سے اس محدود اندھیری کوٹھری میں اپنی نئی ادھ

اپنی دانست میں روشن زندگی شروع کر ڈالی۔ چند ہفتوں تک نذیر مزے سے اپنے دوست کی کمائی پر ممکنہ عیش کرتا رہا پھر ناظرہ نے اسے غیرت دلائی یہ انداز زندگی ٹھیک نہیں وہ خود اپنے لیے کوئی کام کاج ڈھونڈے ورنہ مجبورًا ناظرہ کو ہی کوئی کام ڈھونڈنا ہوگا۔ نذیر تھا تو کچی عمر کا لیکن اس بات سے شرمندہ ہو کر فورًا کام ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا اور آخر کار اپنے دوست کی مدد سے ایک چھوٹی سی ملازمت اسے حاصل ہو گئی۔ یہ عارضی کام چلاؤ ملازمت بھی اس وقت انھیں دم غنیمت معلوم ہوئی کیونکہ وہ اپنے دوست سے مزید میزبانی کے فرائض نہیں ادا کروانا چاہتے تھے اور اس سے امید رکھتے تھے کہ اپنی آپسی رفاقت کے سہارے زندگی میں جم ہی جائیں گے تو جب ناظرہ کو اکیلا چھوڑ کے نذیر کام پر جانے لگا تو ناظرہ تنہائی سے بہت گھبرائی۔ اکیلے میں کئی بار اپنے سنگدل باپ اور بے بس ماں کو یاد کر کر کے روتی مگر زندگی کو کچھ زیادہ برتنے سے پہلے ہی اس کی گود میں ایک ننھا منا آگیا تو پھر جیسے ناظرہ خود کو بھی بھول بھال کرنے میں غرق ہو گئی۔ منے کے ساتھ وقت چٹکی بجاتے گذر جاتا تھا جیسے بس ابھی ابھی تو صبح ہوئی تھی اور ابھی ابھی شام ہو گئی۔ شام میں نذیر آجاتا تو ناظرہ کو پھر کچھ اور چاہیے ہی نہیں تھا۔

دنوں وہ دونوں اپنے بچے کے ساتھ منہمک مسرور رہے پھر ایک دن ناظرہ نے نذیر سے کہا۔

" اب تو ہمیں کوئی الگ نہیں کر سکتا، کیوں نہ ہم اپنے والدین کے ہاں لوٹ چلیں " مگر نذیر کو ناظرہ کا یہ خیال پسند نہیں آیا۔ وہ صاف صاف ناظرہ سے یہ نہیں کہنا چاہتا تھا کہ ایک بچے کا باپ بن جانے کے باوجود وہ خود اپنے باپ اور ناظرہ کے باپ سے ڈرتا ہے چنانچہ اس نے ناظرہ کو اس احمقانہ خیال سے باز رکھنے کے لیے یہ بہترین بہانہ بنایا کہ واپسی تو کوئی مشکل نہیں جب چاہے ہو سکتی ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ اب ناظرہ کے ماں باپ اسے گھر میں رکھنے سے انکار کر دیں اور خود اس کے ماں باپ بھی بچہ چھین کر ناظرہ کو دھکے دے کر نکال دیں۔

بچہ چھن جانے کے کرب سے ہول کر ناظرہ نے پھر کبھی والدین کے ہاں واپسی کے لیے اصرار نہیں کیا اور خاموشی سے مان لیا کہ انحراف کبھی اعتراف میں بدل جائے تو بدل جائے مگر عزت افزائی میں بہر حال نہیں بدل سکتا۔

اور جب یہ طے پا گیا کہ انھیں یہیں رہنا اور زندگی اسی انداز میں گذارنا ہے تو محض اپنے بچے کی خاطر ناظرہ نے اپنی واپسی کی خواہش کو کچل ڈالا اور خاموشی اور قناعت کی زندگی گذارنے لگی۔

منا سال بھر کا ہوا تو ایک شام نذیر گھر ہی واپس نہ آیا۔ ناظرہ منے کے ساتھ مل کر جگہ جگہ نذیر کو ڈھونڈتی پھری تب کسی نے اسے یہ اطلاع دی کہ نذیر تو ایک دوسری لڑکی کے ساتھ کسی نامعلوم جگہ روانہ ہو چکا ہے اور شاید اب کبھی نہ آئے۔

پہلے تو ناظرہ نے اس اطلاع پر یقین نہیں کیا مگر رفتہ رفتہ آس پاس کے لوگ اسے یقینی انداز میں بتانے لگے کہ نذیر تو کافی عرصہ سے اس لڑکی پر مہربان تھا تو آخر کار عورت ہونے کے ناطے ناظرہ کے دل میں بھی ایسی گرہ پڑ گئی جس نے اسے ہر طرف سے بند اور مقفل کر دیا جس نذیر کے لیے اس نے اپنے ماں باپ کی پروا نہ کی تھی جس کے وعدوں کو اپنی تمام زندگی مانا تھا، انھیں اب اپنے اندرون کے قبر میں دفن کر کے وہ نذیر کو یوں نظر انداز کر گئی جیسے کبھی بھی کسی نذیر کو جانتی ہی نہ تھی۔ نذیر کے غائب ہو جانے کے بعد اب وہ اس کے دوست منے کی کوٹھری میں رہنا بھی نہ چاہتی تھی حالانکہ منے پر اس کا پورا بھروسہ تھا پھر بھی ایک شام کپڑوں کی ایک چھوٹی سی پوٹلی اور منے کو سینے سے لگائے سب سے دور والے اسٹیشن کا ٹکٹ خرید کر وہ دوبارہ ریل میں بیٹھ گئی۔ پہلی بار اجنبی سفر نذیر کی ہمراہی میں خوشی خوشی کٹا تھا مگر یہ سفر اسے نہ جانے کہاں پہنچانے والا خوشی اور اعتماد سے خالی تھا۔ کمپارٹمنٹ میں بہت سے لوگ تھے مگر ناظرہ کو کسی کا احساس نہیں تھا۔ اپنے ڈھیروں آنسو خود میں روکے وہ ایک زخم کی طرح رسے جا رہی تھی۔ اگر منا نہ ہوتا تو شاید وہ کنویں میں کود جاتی مگر ماں ہونے کے ناطے وہ منے سے بے وفائی اور کوئی زیادتی چاہنے پر بھی نہ کر سکتی تھی۔ اس لیے جب آخری اسٹیشن پر پہنچ کر ریل گاڑی رک گئی تو تمام مسافروں کے ریلے میں وہ بھی ڈبے سے نیچے اتر کر نام خدا ایک جانب چلنے لگی۔ چلتے چلتے تھک گئی تو ایک پیڑ کے نیچے سستانے کے لیے بیٹھ گئی بیٹھے بیٹھے اسے پتہ بھی نہ چلا کہ وہ کب زمین پر ڈھے گئی اور بھوک پیاس اور صدمے اور ذہنی نقاہت سے بے ہوش ہو گئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک چھوٹے سے کمرے کے کونے میں ایک چٹائی پر

چت پڑی ہوئی تھی۔ حواسوں میں آتے ہی ناظرہ نے اپنا بچہ ٹٹولا اور اسے نہ پاکر ہڑبڑا کر پاگلوں کی طرح چلائی: "میرا بچہ! میرا منّا۔۔۔۔۔" اس کی چیخ سن کر چند عورتیں کمرے میں داخل ہو کر اسے سنبھالنے لگیں: "گھبراؤ مت یہ رہا تمہارا بچہ۔ ٹھیک ٹھاک ہے بالکل۔ ہم نے اسے دودھ پلا دیا ہے، تم خود کو سنبھالو بہن۔" اپنے بچے کو صحیح سلامت پاکر وہ ہمدردی اور بے بسی سے ان اجنبی عورتوں کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ان کا شکریہ کس طرح ادا کرے۔ ان سب عورتوں نے مل کر گرم کھچڑی کے چند نوالے زبردستی ناظرہ کو بھی کھلائے اور بتلایا کہ اسے راہ میں بے سدھ پاکر بستی والے اسے یہاں اٹھالائے ہیں۔ ذرا سنبھل جائے تو وہ بے شک اپنے گھر جا سکتی ہے۔

گھر کا نام سن کر ناظرہ بلک بلک کر روئی بے تحاشہ روئی۔ وہ سارے آنسو جو اس کے اندر قید تھے ذرا سا خلوص پاکر دریا کی شکل اختیار کر گئے۔ جانے وہ کب تک روتی رہتی اگر بستی والے اسے سمجھا بجھا کر خاموش نہ کرواتے۔ اس کی کہانی سننے کے بعد سبھی کو اس سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ وہ سب چھوٹی سی بستی کے مزدور پیشہ لوگ تھے کوئی بھی مالدار عہدے دار نہ تھا مگر سب انسانیت کے علمبردار تھے ان کے بے پڑھے لکھے دماغوں میں صرف خدا کے اعتقاد کی روشنی تھی اور ان کے مدقوق کمزور جسموں میں انسانیت کی نرمی اور گداز۔ دو چار دنوں تک بستی کی تقریباً سبھی عورتیں ناظرہ کے ساتھ لگی رہیں اس کے بچے کو سنبھالتی ہوئی سے ڈھارس بندھاتی رہیں اور پھر چار پانچ روز کے بعد وہ سب ناظرہ کو لے کر بستی کی واحد مسجد کے امام صاحب کے پاس پہنچیں۔ ان تمام عورتوں کی موجودگی میں ناظرہ کی روداد سن کر امام صاحب نے کہا: "معلوم نہیں بیٹی تم سچی ہو کہ غلط مگر یہ مسجد خدا کا گھر ہے یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ اس لیے تم بے شک بستی میں رہ کر عبادت گذاروں کی خدمت کر کے اپنی زندگی گذار سکتی ہو۔ اگر چاہو تو محنت مزدوری بھی کر سکتی ہو۔ بستی والوں نے اگر تمہیں پناہ دی ہے تو اس کا مطلب ہے اس مسجد پر تمہارا بھی حق ہے کیونکہ خدا کسی مخصوص بندے کا نہیں ہوتا وہ سب کا ہوتا ہے جو چاہے اُسے پکارے۔"

یہ سن کر ناظرہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ خوب رونے سے جب اس کی بھڑاس نکل گئی تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے بستی والوں سے اس طرح گھل مل گئی جیسے یہاں چند روز سے

نئی ہوئی نہ ہو بلکہ یہیں پیدا ہوئی اور پرورش پائی ہو۔ وہ بستی کے تمام گھروں کا بے حد خیال رکھتی۔ کسی کام سے پیچھے نہ ہٹتی ہر ایک کا ہاتھ بٹاتی اور تمام مرد لوگوں کا باپ اور بھائیوں کی طرح احترام و لحاظ کرتی۔ جلد ہی ناظرہ اس اجنبی بستی کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئی۔ بستی کے سکھ میں سکھی ہونا اور دکھ میں دکھی ہونا ناظرہ نے اپنا شعار بنایا۔ کسی کی روٹی پکاتی تو کسی کے کپڑے دھو دیتی۔ بیمار کی تیمارداری کرتی تو سہاگنوں کے ساتھ مل کر خوشی کے گیت گاتی ناچے پڑے۔ نلکی بچوں کے ساتھ کھیلتی تو لپک لپک کر بڑے بوڑھوں کا کام انجام دیتی ان کا حکم بجا لاتی۔ اس کے علاوہ وہ پوری پابندی سے صبح و شام مسجد کی جھاڑو لگاتی۔ آپ خورے دھوتی۔ جب فرصت میں ہوتی تو خاموشی سے سر جھکا کے ادب کے ساتھ امام صاحب کو تلاوت کرتے ہوئے سنتی۔

اس پیاری زندگی نے ناظرہ کی تمام بے قراری سمیٹ کر رفتہ رفتہ اسے بے حد پر سکون بنا دیا۔ اب نہ اسے گھر کی یاد آتی نہ والدین کی کسک ستاتی اور نہ نذیر کے نام سے گھن آتی بھولے بھٹکے تمام کوشش کے باوجود رہ رہ کر یہ نام اس کے ذہن میں سر ابھارتا تو ناظرہ سانپ کے پھن کی طرح اسے اپنے مستحکم ارادے کی مضبوط لاٹھی سے کچل کچل دیتی وہ بنیادی طور پر بے وفا نہیں تھی نہ ہی وفا کی قدر دان تھی اور نذیر نے اسے بیچ بھنور میں چھوڑ کر جس سفاکی کا مظاہرہ کیا تھا وہ ناقابل معافی تھا۔ عورتوں کے پھیر میں تو بہت سے مضبوط مرد بھی پگھل کر پانی ہو جاتے ہیں لیکن جو مرد اپنی اولاد کا قاتل بن جائے اپنی اولاد کو بھول جائے اس کی عزت جاہل سے جاہل عورت کو بھی گوارہ نہیں ہوتی۔ یہ بات ناظرہ بخوبی جان چکی تھی کہ جس غلط طریقے سے اس نے زندگی کو اپنایا اس کا یہی نتیجہ ہونا تھا جو ہوا چنانچہ اب وہ صحیح راستہ اختیار کرنا چاہتی تھی تاکہ شنے کا دفاع ہو سکے۔ منا خاطر خواہ فخر سے زندگی گذار سکے محض اس کے گناہ کا پھل نہ کہلائے۔

اپنے اس ارادے پر اٹل وہ منے پر ہر طرح نازاں تھی کہ اچانک ہی جانے کس طرح ہنستا کھیلتا کودتا منا دیکھتے دیکھتے بیمار پڑا اور بیماری کی تشخیص ہو کر علاج کیے جانے سے پہلے ہی چٹ پٹ خدا کو پیارا ہو گیا۔

اس ناگہانی سے ناظرہ ہکا بکا سراسیمہ ہو گئی۔ تن بہ تقدیر تنہا۔ اس کی کل زندگی

کل متاع اس کا بیٹا خلاف توقع یوں آناً فاناً اس سے چھین لیا گیا جسے بچانے کے لیے وہ کچھ بھی نہ کر سکی تو وہ ایک دم گم صم ہو گئی۔ اپنے بچپن اپنی جوانی اپنے تمام ماضی کی طرح وہ اب بستی والوں سے بھی بے نیاز ہو گئی۔ بستی والوں نے اسے سنبھالنے کی پوری کوشش کی۔ طرح طرح کے بہلاوے دیے، امام صاحب نے اس کے سر پر ہمیشہ شفقت اور دلاسے کا ہاتھ رکھا مگر منے کے کھونے کے بعد اب ناظرہ کی زندگی کا جیسے کوئی جواز ہی نہ رہ گیا تھا۔ وہ دنوں بھوکی پیاسی اپنے سے اور تمام بستی سے بے گانہ منہ لپیٹے پڑی رہی۔ بستی والوں کے لاکھ سمجھانے منانے پر بھی ایک لقمہ نہ توڑتی۔ بس اسے رہ رہ کر بچپن میں اپنی ماں سے سنی ہوئی یہ بات یاد آئے جاتی کہ کوئی دیکھے نہ دیکھے کسی انعام سے نوازے نہ نوازے کسی خطا قصور پہ سزا دے نہ دے مگر خدا سب کچھ دیکھتا اور تولتا ہے بیٹی۔ اس لیے خوفِ خدا بہت ضروری۔

یقیناً یہ سزا تھی ناظرہ کے لیے اپنے والدین کو دھوکا دینے اور خود کو ناحق خراب کرنے کی جو بستی کے خلوص اور امام صاحب کی شفقت کے زیرِ سایہ مسجد کے نورانی و مصفا ماحول میں اس کی تمام بے بضاعتی اور صدق دلی کے باوجود اسے ملی۔ بچپن میں بار بار ماں کے کہنے جتلانے پر بھی ناظرہ کو خوفِ خدا کا احساس و اندازہ نہیں ہوا تھا مگر اب خوفِ خدا ایکدم ناظرہ میں پوری معنویت کے ساتھ ابھرا۔ ناظرہ کا مرجھایا ہوا بے کس ان کہے دکھوں سے ملفوف و مغموم چہرہ یکایک پھٹتی ہوئی پو کی طرح خیرہ کن اور نظر نواز ہو گیا بستی والوں نے اور امام صاحب نے تعجب سے ناظرہ کے اس جمال و جلال آب و تاب کو دیکھا مگر نہ ناظرہ نے خود اپنے چہرے کو دیکھا نہ خود میں اتنی بڑی تبدیلی کو محسوس کیا جس پھٹے پرانے مستعمل پیوند لگے دوپٹے سے وہ اپنا منہ لپیٹے پڑی تھی اسی سے "گلدانا"، (نماز ادا کرتے وقت تا نماز مسلمان عورتیں جو دوپٹہ اپنے سر اور چہرے کے اطراف بیٹھتی ہیں اسے گلدانا کہا جاتا ہے) بنا کے صدق وجود اور احساسِ عفو و شرم سے وہ خدا کے حضور جھکی تو پھر جیسے منے کو بھی بھول بھال کر خدا کے حضور جھکی ہی رہ گئی اپنی پیدائش سے لے کر اس وقت تک کے تمام حالات و واقعات اس کی زندگی کے تمام گرداب تھوڑی سی مسرت سب کچھ کلی طور پر اس انہماک کے نذر ہو گیا اب وہ تھی اور

فقط جائے نماز۔ اسے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ بستی کے علاوہ آس پاس کی بستیوں کے بھی کتنے ہندو مسلمان عیسائی لوگ اس کے دیدار اور ایک نگاہِ التفات کے لیے اس کی عقیدت و عظمت کے اعتراف میں ہمہ وقت اسے تکتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ امام صاحب کی متبرک نگاہیں بھی اب ناظرہ کی طرف اٹھتے ہوئے تقدس سے جھک جایا کرتی ہیں کہ اب تو بس ناظرہ تھی اور ہر دم خیالِ خدا کا طواف۔ یہ طواف ہی اب اس کی سانس تھا۔

حاصلِ حیات

فراٹے بھرتی ہوئی دیوان صاحب کی موٹر میں شہر سے اپنے گاؤں لوٹتے ہوئے لیش رہ رہ کر یہی سوچ رہا تھا کہ زمین، پہاڑ، درخت، دریا اور دیوان صاحب کتنے فیاض ہیں جنھوں نے اسے زندگی کا گداز بخشا۔ فن کی گویائی اور خلوص کا ادراک دیا۔

پھر ملال کے ایک جاں گسل احساس نے اس کی رگ رگ میں کڑواہٹ دوڑا دی۔ دیوان صاحب کے پاس شہر جانے سے قبل کی اگر کوئی یاد اس کے ذہن میں تھی تو وہ تلخ اور ترش حقیقتوں کی وہ اذیت ناک یادیں تھیں جو ماں کی گھڑکیوں اور تنبیہوں کی صورت میں اس کے ذہن میں محفوظ تھیں۔ پڑھنے لکھنے کی بجائے جب وہ اسکول کی کاپیوں پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتا تو ماں بہت ناراض ہوتی۔ اسے مارتی اور کوستی۔

”پاپی! تو سکول جائے گا بھی یا پیڑوں کے نیچے بیٹھا یونہی اوٹ پٹانگ لائنیں کھینچتا رہے گا؟“

ماں کاپیاں اور قلم اس سے چھین لیتی۔ غصے سے اسے گھورتی اور جواب میں اس کی دلیرانہ دزدیدہ نگاہیں پڑنے پر اسے مزید طمانچے لگاتی۔ ”اسکول کی کاپیوں کا کیسا ستیاناس کیا ہے تو نے!“

آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے وہ کبھی ماں کو نہ بتا سکا کہ اسکول ماسٹر کا کہا سننے سے کہیں زیادہ لطف چڑیوں کے چہچہوں، درختوں کے سایوں، اور چھل چھل بہتے پانی کی روانی

ہیں ہے۔ نیلا بے کراں آسمان یونہی خاموش نہیں کھڑا ہے بلکہ شوکت و عظمت کے صد ہا اسرار
بھی دیکھنے والوں پر کھول رہا ہے۔ اس کے علاوہ بھی جو کچھ اطراف میں پھیلا ہوا ہے وہ محض
بے وقعت، بے ربط نہیں، اپنے آپ میں پورا ایک دیس ہے جس کی برابری دنیا کی کوئی کتاب
ہرگز نہیں کر سکتی۔ ایسے میں نہ جانے کتنے احساس اس میں اجاگر ہوتے، رجائیت کے نہ جانے
کتنے چشمے پھوٹتے۔ جستجو کی کتنی آگ بھڑکتی۔ کچھ نیا انوکھا کر گذرنے کی کتنی تمنائیں انگڑائیاں
لیتیں مگر ماں کی مار کھا کے ان سارے احساسات کو اپنے اندر دبا کے وہ تھوڑی دور تک
اسکول جانے والے راستے پر ضرور چل پڑتا مگر جلدی مار کی تکلیف بھول کر راہ میں کہیں نہ
کہیں بیٹھ کر سفید کاغذ کے سینے پر پھر بے مقصد لکیریں کھینچنا شروع کر دیتا۔ اسے خود ان
لکیروں کا مفہوم نہیں معلوم تھا مگر اس مشغلے میں جو بے اندازہ سکون تھا وہی اس کی مجروح
ہستی کے لیے تسکین بن جاتا۔ یہ عرصہ بہت مختصر ہوتا کیونکہ شام میں پھر وہی گھر وہی
سخت گیر ماں باپ، وہی تھکا دینے والی گھریلو مصروفیتیں جن کی پابندیوں سے وہ عاجز آ گیا
تھا مگر جن سے فرار کی اس کے پاس کوئی راہ نہ تھی۔

ماں باپ کی یہ خواہش شاید فطری تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر کچھ بنے۔ اپنے مستقبل کا اچھی
طرح سواگت کرے مگر یہ تو جیسے ہی بندشوں نے ایک زخم بن کر رہ گیا تھا۔ ماں باپ کی بڑھتی
ہوئی سختیوں اور تنبیہوں کے باوجود جب اس نے اپنی روش نہ چھوڑی تو آخر کار تنگ
آ کے اس کے باپ نے اسے دیوان صاحب کے ہاں چھوڑ دیا۔

دیوان صاحب ان کے کوئی عزیز رشتے دار نہیں تھے مگر انھیں کے گاؤں کے خاندانی
رئیس تھے جو زمینداری کو ڈانواڈول دیکھ کر شہر میں جا بسے تھے۔ وہ بڑے غریب پرور
تھے۔ گاؤں کے نادار شرفا کے اکثر لڑکے انھیں کے خرچ پر لکھ پڑھ کر روزی کما رہے
اپنے خاندانوں کو بحسن و خوبی سنبھال رہے تھے۔ لائق بیٹے کو بھی بننا تھا۔ نالائق بنے
رہ نہیں سکتی تھی سو مستقبل کی حفاظت کی خاطر بھی دیواروں سے گھرے محفوظ گھروندے
میں دبی دبی سانسیں لینے والا یہ شخص جب اونچی اونچی آسمان تک پہنچتی دیواروں میں
اٹھ آیا تو ان کی اونچائی اور آرائش و سجاوٹ دیکھ کر ایسا بوکھلایا کہ دنوں بنا سبب

شوق کورے کاغذ پر لکیریں کھینچنا بالکل ہی بھول گیا ان دیواروں پر آویزاں ایک ایک تصویر کے مناظر اور نقوش کو اپنی کپکپاتی انگلیوں سے چھو چھو کر سوچتا رہا کہ ان کے رنگ اور نقش کیسے بنے ہیں؟ کس نے بنائے ہیں؟ اور کئی دن کی توجہ کے بعد جب لیش کو یقین ہو گیا کہ یہ کوئی طلسم نہیں بلکہ انسانی کمال ہی ہے تو ایک بھرپور خیال بجلی کی طرح اس کے دماغ میں کوندا کہ اس کی آڑی ترچھی لکیریں بھی ایسے ہی نظر نواز مناظر اور رنگیلے تیکھے نقوش میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔ اگر وہ بھی جان کی بازی لگا دے تو۔

دنوں وہ یہی سوچتا رہا کہ ایک دن دیوان صاحب نے اس کی ہر دم کی سوچ سے گھبرا کر پوچھا۔

"یہ ہر وقت بیٹھے کیا سوچا کرتے ہو آخر؟"

لیش بوکھلا کر بولا "جن پریوں شہزادیوں اور چمنستانوں کی کہانیاں بچپن میں سنا کرتا تھا انھیں آپ کی کوٹھی کی دیواروں پر مجسم دیکھ کر ہڑبڑا گیا ہوں دیوان جی!"

یہ سن کر دیوان صاحب مسکرائے۔ ان کے ساتھ ان کی عقل اور فراست مسکرائی۔

"اور تم ان تک پہنچ بھی سکتے ہو لیش۔ اگر محنت کرو تو!"

خلافِ امید دیوان صاحب سے یہ حوصلہ افزا جملہ سن کر لیش بے ساختہ اچھل پڑا۔

"میں دیوان صاحب؟ کیا مطلب۔؟" اسے یقین نہ آیا کہ شاید یہ بھی ایک خواب ہے کھلی آنکھوں کا خواب......

مگر اگلے ہی دن اپنے کمرے میں مصوری سے متعلق بہت سا سامان دیکھ کر لیش الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ اگر وہ ان چیزوں سے انصاف نہ کر سکا ان کا صحیح استعمال نہ کر سکا تو کون سا منہ لے کر دیوان صاحب کے آگے جا سکے گا؟ تو کیا ب اسی وقت شرمندگی سے بچنے اور اپنی لاج رکھنے کے لیے وہ اپنے مٹی کے کچے گھروندے کو واپس بھاگ جائے۔

تبھی کوئی کمرے میں داخل ہوا اور ایک متبسم چہرے نے اس کے قریب پہنچ کر لیش کے چہرے کی سلوٹیں دیکھ کر اسے سمجھایا۔

"پریشان مت ہو لڑکے۔ ہر کوئی پیدائشی یکتا نہیں ہوتا۔ اپنا مقصد یا النصب العین

حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ استقلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ کر سکو گے ریاض؟"

لیش کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔ حیران حیران آنکھوں سے تنے اور ڈھاریں بندھانے والے مہربان اور ان روزنوں کو دیکھتا رہا جن سے چھن چھن کر ابھرتے سورج کی شعاعیں کمرے کو اجالنے لگی تھیں۔ نہیں معلوم کتنا وقفہ کتنی ساعتیں خاموشی سے گذر گئیں۔ لیش بالکل ساکت رہا اور آنے والا تمام سامان قرینے سے سجاتا رہا تبھی دیوان صاحب نے ان دونوں کو بلوایا اور دونوں چہروں کے تاثرات کو پتلی نگاہ سے جانچ کر قدرے بے تکلفی سے کہا۔"کیوں میاں لیش، اپنے یہ نئے دوست اور رہنما تمھیں پسند آئے یا نہیں؟"

لیش ہکلا کر رہ گیا۔

دوستی؟ جس سے وہ کبھی آشنا نہ ہوا جانے دوستی میں کیا کچھ کرنا پڑے۔ اور کہیں یہ رہنما بھی اسکول ماسٹر نہ بن جائے ..... لیش کو اپنی سوچوں میں گم چھوڑ کر ابھے ادب سے بولا۔ "آپ کی نگاہِ انتخاب کی داد ضروری ہے دیوان صاحب۔ مصوری کے لیے اس طرح کی تڑپ اور بے قراری خود ایک منزل ہے اتنا یقین تو دلا ہی سکتا ہوں آپ کو۔"

یہ سن کر لیش نے اچانک نظر اٹھائی تو دیوان صاحب کی بولتی ہوئی آنکھوں کے سارے معنی ومطالب یکایک سمجھ لیے۔ وہ مطالب جو اس وقت سے قبل تک کبھی اس پر آشکارا نہ ہو سکے تھے مسرت کی ناقابلِ یقین لہریں بن کر اس کا جسم وجان بن گئے۔ اپنی ہستی کے بے پناہ تموّج کو خاموشی سے دبائے دیوان صاحب کے پاس سے اپنے کمرے میں پہنچ کر اس روز پہلی مرتبہ لیش نے بے معنی لکیروں کی بجائے نئی نئی شکلیں بنانے کی کوشش کی۔ خود میں رچی بسی جستجو اور خوشبو کا علانیہ استقبال کیا تو پھولوں بدلیوں اور پنچھیوں کو سفید صاف کاغذ پر جلد جلد مجسم کرنے لگا۔ اس کی لرزاں انگلیاں اس وقت ایک نئے عزم سے معمور ہو گئیں تب گذرتے ہوئے دنوں کے ساتھ دیوان صاحب کے مزاج کا ہمت افزا رچاؤ لیش کی نا تراشیدہ ذات سے ان کی بھرپور دلچسپی، لیش پر ان کا اٹل اعتماد دیش کی انگلیوں میں ایک نئی قوت بن کر دوڑنے لگا۔ خود پر دیوان صاحب کے اس بھروسے کا جواب وہ اپنے فن سے مکمل سپردگی اور خود اپنے اٹل انہماک سے دینا چاہتا تھا۔ اپنے اندر کے

ناتجربہ کار فنکار کو اپنی ازلی تمنا اور دیوان صاحب کی محبتوں سے سرشار اس پختہ کاری کی طرف لے جانا چاہتا تھا جو دیوان صاحب کے فخر کا سر مزید بلند کر دے۔

ایسے میں ابھی سے اسے بتایا کہ موضوعات کا سبھاؤ اور بانکپن ایک ہی انداز پر منجمد ہونے کی بجائے تنوع کی طرف گامزن رہے تو فن کے نئے نئے پہلو اور ان کی نزاکتیں اپنے آپ کھلتی رونما ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ایسے میں انھیں ابھارنے کے لیے کسی خاص سعی کی ضرورت نہیں رہتی تو یہ سن کر لیش کو دیوان صاحب کی گیلری میں لگی وہ تمام تصویریں یاد آگئیں جن پر اصل زندگی کا گمان ہوتا تھا جو دیکھنے والے کی نظر اور فکر کو اتنا مستعد اتنا چوکس کر دیتی تھیں کہ اس وقت انھیں دیکھنے والا خود کا مصوری کا شاہکار بن جاتا تھا لیکن وہ کیسے اتنی بڑی جرأت کر ڈالے۔ اس کے پاس تو اب تک سوچ کا ایک ہی زاویہ تھا فکر کا ایک ہی ڈھنگ اپنی مٹھی بھر زندگی میں اس نے کبھی ایسے بولتے ہوئے حقیقی نقوش نہیں دیکھے تھے۔ سچ سچ سچائی اس وقت تک ادھوری رہتی ہے جب تک واقعی حقیقت نہ بن جائے۔ لیکن کتنی بھی شدید تصویر کتنا بھی طاقتور موضوع کتنا بھی دل آویز سہی حقیقت میں ہر حالت میں کم تر گمز ہوتا ہے۔ اس رات اندھیرے اجالوں کے سحر سے مبہوت جب لیش نے پہلی مرتبہ جب انسانی نین نقش اپنے ذہن میں مرتب کرنے شروع کیے تو لاکھ کوشش کے باوجود ہار گیا۔

دیوان صاحب کے پاس آجانے کے بعد وہ پھر کبھی اپنے گاؤں نہیں گیا تھا۔ اس کا باپ ہی اکثر اس کی خیر خیریت لینے دیوان صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جایا کرتا تھا مگر باپ کا چہرہ ایسا نہ تھا جو لیش کی امنگوں کا موضوع بن سکتا خشک کھر درا خاشاک کی طرح کا چہرہ جس کے بے جان خدوخال میں کہیں بھی ذرا سی روانی اور نرمی نہیں تھی۔

اور ماں اسے یاد تو اکثر آتی تھی مگر ماں کے ساتھ ساتھ اس کی ڈانٹ پھٹکار اور عدم اعتماد ہمیشہ ماں کی ملائمت کو ڈھک دیا کرتا تھا۔ لے دے کر گڑیا کی طرح اس کی ایک ننھی کھلونا سی بہن ہی تھی جو اس کے ذہن کے وسیع افق پر دور ٹمٹماتے ستارے کی طرح جھلملا کرتی مگر اتنے مٹے مٹے نرم و نازک بے لوث خدوخال کو کاغذ پر ان کی

صحیح کیفیات کے ساتھ اجاگر کرنا قی الحال لیش کے لیے ناممکن تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی پہلی ہی کوشش ناکام ہو جائے مگران کے علاوہ کوئی چہرہ ایسا بھی تو نہ تھا جو بطور تمہید ہی سہی اس کی خواہش بن سکتا تھا کہ لیش نے کئی بار خود اپنا ہی چہرہ بنایا مگر ہمیشہ نامطمئن ہوکر پرزے پرزے کرڈالا۔ وسعت، دل دماغ، فکر و نظر، جذبات و تصورات کی فن کی صداقت کے لیے بیحد لازمی.....

ابھے اسے برابر یاد دلاتا رہتا۔

اور جب لیش اپنی تمام کوششوں میں ناکام ہو کر مایوسی کی انتہا پر پہنچ رہا تھا تبھی بھیروں ایکا ایکی اس کے سامنے آگئی۔

دیوان صاحب کی لڑکی بھیروں جو چھٹیاں گذارنے دہرہ دون کے ہاسٹل سے اپنی کوٹھی لوٹی تھی اسے دیکھ کر لیش حیرت و اضطراب کے مارے پھر ایک بار دوڑا دوڑا گیلری میں پہنچا ور قیمتی فریموں میں آویزاں دیواروں پر ٹنگی نایاب و نادر تصاویر کو بغور دیکھنے لگا۔ کہیں بنانے والوں نے یہ تمام تصویریں بھیروں سے متاثر ہو کر تو نہیں بنائی ہیں۔

س کی اپنی حقیقی زندگی میں یہ پہلا چہرہ تھا جو موسم بہار کی طرح شاداب خوشگوار تمازت کی طرح طرب افزا اور امید کی طرح صحت مند تھا جو محض تصور نہ تھا۔ تمنا نہ تھا۔ لیش دیر تک اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتا رہا تب پورے دھیان تمام تر انہماک اور نہایت حتیاط سے اس نے مختلف رنگ آپس میں ملائے اور بیحد عرق ریزی محویت ور رحجان کے ساتھ بے داغ کینوس پر بھیروں کو اجاگر کرنا شروع کیا۔

پہلا رنگین پیکر جسے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا احساس کی تمام تر لطافت سے محسوس کیا۔ دل و دماغ کی عمیق گہرائیوں سے اپنے موضوع کے لیے منتخب کیا۔ ابھے کی معیت میں یوں تو اس نے کتنی ہی تصویریں بنائی تھیں۔ فطرت کی۔ تتلیوں پھولوں پنچھیوں کی۔ قدرتی مناظر کی مگر انسانی نین نقش نے اب سے پہلے کبھی اس کے ادراک کو سرفراز نہیں کیا تھا مگر اب لیش اس طرح کام کر رہا تھا جیسے اس کے ذہن ور انگلیوں میں کوئی جادوئی قوت سما گئی ہو۔ بغیر تھکے بغیر رُکے بغیر کچھ سوچے وہ اس لازوال

چہرے کو نہایت عجلت سے سمیٹ لینا چاہتا تھا جو اس کے پیش فن تھا اور اپنے اوصاف کے لحاظ سے یقینی طور پر ابدی محسوس ہوتا تھا۔

انسان مر سکتے ہیں مگر خوبصورتی کبھی نہیں مر سکتی یہ لیش کا پکا عقیدہ تھا اور ہفتوں کی محنت اور کاوش کے بعد جب بھیرویں آخر کار کینوس پر منتقل ہوئی تو اپنی اس کوشش بلکہ کمال کو دیکھ کر لیش بھی عش عش کرا ٹھا۔ دلوں اسے یقین نہ آیا کہ یہ اسی کی کاوش کا کرشمہ ہے مگر بھیرویں کے وجود کی حقیقت کی طرح اس کی شبیہہ بھی لیش کے عرفان فن کی امین تھی۔

دونوں میں اگر کوئی فرق تھا تو بس اتنا کہ حقیقی بھیرویں ہنس سکتی تھی گنگنا سکتی تھی گا سکتی تھی بول سکتی تھی جبکہ کینوس کی بھیرویں صرف اپنے چہرے اور خد وخال سے ہی ان تمام تاثرات کی حامل تھی۔ اگر وہ بھگوان ہوتا تو اپنی اس بھیرویں کو بھی آواز سے مالا مال کر کے خود امر ہو جاتا لیکن وہ تو بہر حال ایک انسان تھا تاہم جب جب اپنی بنائی ہوئی بھیرویں کو دیکھتا تب تب اس گمان سے گذرتا جیسے جیتی جاگتی متحرک بھیرویں خود اس سے پوچھ رہی ہو: تم نے اب سے پہلے مجھے کیوں نہیں دیکھا؟۔

اب تو اپنی بے قراری بھول جاؤ گے نا؟۔

خود پر اتراؤ گے نا؟۔

بے شک، بے شک۔ خود سے مغلوب اس کا رواں رواں رقص کرنے لگتا پھر نیم مدہوشی سے ہوش میں آکر یہ خوف اس پر مسلط ہونے لگتا کہ اگر دیوان صاحب نے کبھی بھیرویں کے اس پورٹریٹ کو دیکھ لیا اور اس کی اس جسارت پر برہم ہو اٹھے تو۔؟

تو۔؟

اس کا تو تمام مستقبل ہی ختم ہو جائے گا اس کی زندگی کا کوئی جواز ہی باقی نہ رہے گا۔

اس سوچ کے تحت لیش کو یہی بہتر معلوم ہوا کہ ابھی سے بھی اس پورٹریٹ کی پردہ داری کر دے اور واقعی ایسے کھوجتا ہی رہ گیا مگر خوف کے خوفناک جانوروں کی چنگھاڑ سے خوف زدہ لیش نے وہ پورٹریٹ ایسا چھپایا کہ ابھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر بھی اسے نہ پاسکا۔

لیش کسی طور کسی قیمت پر اپنے محسن دیوان صاحب کو ناراض نہ کرنا چاہتا تھا۔

بھلے ہی وہ تہی دست و تہی داماں رہ جاتے۔

دیوان صاحب جنھوں نے اس کے لیے راہیں ہموار کیں، اسے فن کے معنی سمجھائے اور فن کے توسط سے اسے جس نے زبردست ترغیب دی۔ اسے اپنی ایک منفرد شناخت عطا کی کیا وہ انھیں کے رنج و ملال کا باعث بن جائے۔؟ تب دنوں لیش ہاتھ پر ہاتھ رکھے ساکت بیٹھا رہا۔ اس تمام عرصے میں اس نے ابھے کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔

بھیرویں کو فنی طور پر محفوظ جہاں وہ دلی طور پر نازاں تھا وہیں اپنے باطن میں سہما سہما بھی اب اس کی علانیہ کوشش یہی تھی کہ دانستہ یا نادانستہ زیادہ سے زیادہ ممکنہ حد تک دیوان صاحب اور ابھے سے بچے۔ دیوان صاحب کی ضروری طلبی پر وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا بھی تو اپنی نگاہیں ہمیشہ جھکائے رکھتا جیسے نظر اٹھا کر وہ بھیرویں کا اعتراف نہیں کرنا چاہتا اور اعتراف حق کے بعد قصوروار کہلانا گوارہ نہ کرسکتا۔ جب تک بھیرویں دیوان صاحب کی پدرانہ شفقتوں اور اپنے شوخ و شریر سہیلیوں کے جھرمٹ میں انبساط کا مہتاب بنی دمکتی رہی۔ لیش عمداً اپنے کمرے میں قید رہا۔ اس نے اپنے اطراف تنہائی کا بہ ہاتف مضبوط کرلیا۔ کہ ابھے بھی ان دیواروں کو سر نہ کرسکا مگر اس روز جب بھیرویں اپنی تعطیلات ختم کرکے خوش و خرم جس طرح آئی تھی اسی طرح دہرہ دون اپنے ہاسٹل لوٹنے لگی تو لیش نے آزادی اور اطمینان کی سانس لی۔

اب کوئی خدشہ نہیں۔

خطرہ نہیں۔

افشا کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں۔ کوئی بھی تو نہیں جو اس کے اندرون میں جھانک سکے۔

اور وہ خود اپنے آپ کو کبھی نہیں ٹٹولے گا۔ اس محترم عزم و وعدے کے ساتھ لیش نے اپنے بے نہایت وجود پر اپنے ہاتھوں تالا ڈال کر چابی نامعلوم گہرائیوں میں اچھال دی۔

اور ایسا کرکے اپنی کم مائیگی اور نابرابری سے شکستہ وہ یکلخت اتنا باشعور ہوگیا کہ غم کی تمام تر خراشیں قناعت کے بے اندازہ محاسن بن کر خود اسے تجلی کی طرح دمکانے لگیں دیوان صاحب شاداں تھے اور ابھے متعجب کہ فن کا اتنا طویل اور دشوار گذار فاصلہ لیش نے

اتنی کم مسافت اور مختصر کوشش سے اچانک کس طرح طے کر لیا کیونکہ اپنی فنی آرزو کی تکمیل کے بعد پھر لیش نے جو بھی تصویر بنائی وہ اپنی مثال آپ تھی۔ دیوان صاحب اور ایسے کتنا بھی یقین کریں خود لیش کو یقین نہیں ہوتا تھا کہ ان ماہ پاروں اور شاہ کاروں کا خالق اس کا اپنا ادنیٰ پائمال وجود ہے۔ بڑی احتیاط سے راتوں میں اٹھ اٹھ کر وہ بھیروی کے پورٹریٹ کا دیدار کرتا اور خوش ہوتا۔ یہی ایک خوشی تو اس کی ذات کا عروج تھی اور ایسے جو اس کی خوشی کے مرکز و منبع کی خاموش تلاش میں مصروف تھا آخر کار بھیروی کے پورٹریٹ تک پہنچ ہی گیا۔ اس پورٹریٹ کو دیکھ کر وہ فوراً جان گیا کہ لیش جذبات کی عظمتوں، فن کی رفعتوں اور ادراک کی نزاکتوں سے کیونکر گذرا ہے اور ہنوز گذرتا جا رہا ہے۔ ایسے فن اور فنکار کو ہر قسم کی جذباتی آلودگی سے مبرّا مانتا تھا لہٰذا اس نے وہ پورٹریٹ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے دیوان صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔

ایسے کی طرح دیوان صاحب نے بھی اپنی عزیز ترین متاعِ حیات بھیروی کو کینوس پر متمکن نظرِ تحسین سے دیکھا اور لیش کو مزید نگاہِ التفات سے جس نے ان کی بیٹی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندۂ جاوید کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنے اثر و رسوخ سے فوراً ہی وہ پورٹریٹ مقامی آرٹ کونسل میں ناقدین و ماہرینِ آرٹ کی آراء جاننے کے لیے بلا تاخیر بھجوایا اور جیسا کہ اپنے طور پر انھیں یقین تھا لیش کے بنائے ہوئے بھیروی کے اس پورٹریٹ نے بہترین انعام و اعزاز حاصل کیے اور مناسب عرصے میں مختلف مدارج طے کرتے ہوئے بین الاقوامی مقابلے میں شرکت کے لیے جا پہنچا اور اسی پورٹریٹ نے دیکھتے ہی دیکھتے لیش کو شہرت کی اس صف میں لا کھڑا کیا جہاں سے سمتیں خود لیش کو مزید وسعتوں، مزید بلندیوں کی طرف دھکیلنے لگیں حالانکہ لیش نے کبھی بھیروی سے گفتگو نہیں کی تھی۔ کبھی اس کے بالمقابل نہیں ہوا تھا۔ اسے صرف اپنی احساس کی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ پھر بھی ایک دبے ہوئے انسان کا جبلی خوف اس کے فن کا راستہ نہ روک سکا تھا اور اتنی بڑی لامحدود مغرور زمین جو کبھی لیش کے قدموں تلے حد درجہ محدود تھی اور ہمیشہ کھسکی کھسکی رہتی تھی اب خود سرک سرک کر اس کے قدموں تلے فخریہ بچھی جا رہی تھی۔

بھیروین کو پتہ بھی نہ تھا کہ کیا کچھ اس کی وجہ سے وقوع پذیر ہو گیا۔ مگر مہربان زندگی اب یش کی پذیرائی کے لیے مکمل طور پر آمادہ تھی اور سالوں بعد اب دیوان صاحب کی فراٹے بھرتی ہوئی موٹر میں شہر سے واپس اپنے کچے گھروندے کی طرف لوٹتے ہوئے یش رہ رہ کے یہی سوچ رہا تھا کہ ایک ماں کو اس کا سہارا ایک باپ کو اس کا غرور مل رہا ہے یا ایک دیوانے کو اس کا حاصل حیات۔

کرسی

ماہِ صیام کی آمد آمد تھی اس لیے گھر کا ہر فرد نہایت تپاک اور جوش وخروش کے ساتھ استقبالیہ تیاریوں میں منہمک تھا۔ دادی ماں نے سب کے فرائض بانٹ دیے تھے جنہیں سب فرداً فرداً توجہ اور انہماک سے نپٹا رہے تھے۔

تمام کوٹھی میں از سر نو ڈسٹمپر ہوا تھا اور ہر سال کی طرح کوٹھی کا تمام فرنیچر بھی جدید ترین تقاضوں کے تحت تبدیل کیا گیا تھا۔

چیف جسٹس صدیق ملک ان اقبال مند شخصیتوں میں سے تھے امارت جن کے گھر کی لونڈی اور شرافت جن کے گھر کی حاکم تھی۔ جو صرف اپنے متعلقین کے لیے ہی نہیں بلکہ ہر ضرورت مند کے لیے وقف تھے اسی لیے نہ جانے کتنی دعائیں اور نیک تمنائیں ہمہ وقت ان کے ہمراہ ان کی محنت دیانداری اور دردمندی کو ہمیشہ خراج پیش کیا کرتی تھیں تو دن بھر کی اٹھا پٹک کے بعد تھکے ماندے سارے لوگ رات میں جب اپنے نرم وگرم بستروں کی آغوش میں پہنچے تو احمر نے رضائی میں ڈبکے ڈبکے اپنی دونوں بہنوں تہنیت اور سطوت سے کہا۔

"اور سب تو ٹھیک ہے بہنو لیکن......"

یہ سن کر تہنیت اور سطوت نے اپنی اپنی رضائیوں سے گردنیں تھوڑی باہر نکالیں اور حیرت سے اپنے بھائی احمر کو دیکھا۔

"اس لیکن کا کیا مطلب ہے جناب! کیا کوئی کسر باقی رہ گئی ہے؟"

"ہاں ایک ذراسی" احمر نے سنجیدگی سے کہا۔ "غور کرو! ابا کی اس حد سے زیادہ جاگتی جگمگاتی کوٹھی میں وہ پرانی پھٹیچر کرسی سوائے میرے کسی اور کو نہیں کھلتی بہنو......؟"

"وہ دادی اماں کی کرسی۔ ارے باپ رے....... اس کی بابت تو قیاس آرائی کی بھی کسی کو مجال نہیں تو پھر — ؟"

"ارے ہمت کا ساتھ ہو تو کیا کچھ ممکن نہیں بہنو۔ سب ہو سکتا ہے ناممکنات بھی ممکنات میں بدل سکتے ہیں"

"تو کر لیجیے کوئی انتظام۔ ہم اس معاملے میں آپ کی مدد سے بالکل قاصر ہیں بھائی احمر"

"یقیناً میں تو کچھ نہ کچھ کروں گا ہی لیکن تھوڑی مدد تو ضروری طور پر درکار ہوگی نا میری پیاری دلاری بہنو تم دونوں کو بھی تھوڑی ہمت ضرور کرنا ہوگی"

"کیوں بھئی کس معاملے میں کس کی ہمت کس کو آن پڑی ہے بھلا" انجمن بھابی نے الائچی سے مہکے ہوئے گرم دودھ کے گلاس حسب قاعدہ تینوں کو پکڑاتے ہوئے پوچھا:

"اوہ بھابی..... میری پیاری عزیز از جان بھابی..... اچھا ہوا کہ آپ آگئیں۔ اب میرا مسئلہ یقیناً سلجھ جائے گا" احمر نے رضائی سے تھوڑا سا برآمد ہو کر بھابی کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لیتے ہوئے کہا۔

"مسئلہ...کیسا مسئلہ بھائی — ؟" انجمن بھابی نے احمر کے قریب بیٹھتے ہوئے استفسار کیا۔

"اگر میری مدد درکار ہے تو بہ دل و جان حاضر ہوں"

"واہ ..... یہ ہوئی نا بات ......" احمر نے بڑے بڑے گھونٹ لے کر دودھ کا گلاس خالی کر کے ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا " یہ بتائیے اپنی یہ کوٹھی کیسی ہے بھابی جان؟" بھابی نے حیرانی سے احمر کو گھورا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے میاں..... کوٹھی کیا ہے تراشا ہوا نگینہ ہے جو سب کی توجہ کھینچ لیتا ہے اور سبھی جانتے ہیں کہ ابا حضور کی اقبال مندی کی وجہ سے

ہمارے اطراف میں دور دور تک ایسی کوئی اور مرصّع کوٹھی نہیں ہے۔ کس چیز کی کمی ہے ہمارے پاس ...... کمال تو یہ ہے کہ کوئی چیز پرانی بھی نہیں ہوتی کہ سال کے سال بدل دی جاتی ہے۔ یہی طرزِ جدید تو جان ہے ہماری کوٹھی کی ـــ تو پھر ......؟"

"یہی تو میں عرض کرنا چاہتا تھا بھابی جان مگر ......"

"یہ لو ...... ایسے میں مگر کی گنجائش کس طرح پیدا ہو سکتی ہے آخر۔ ؟ خدا کا شکر ادا کرو اور آرام سے جیو میاں" بھابی جانے کے لیے اٹھیں تو احمر نے ان کا ہاتھ تھام کر انھیں دوبارہ بٹھایا "اس چمکتے دمکتے ماحول میں کیا سچ مچ آپ کو دادی ماں کی پرانی کرسی نظر نہیں آتی بھابی"

"یا اللہ، اگر تمھارا مسئلہ یہ ہے تو یقیناً میں بھی تمھاری کوئی مدد نہیں کرسکوں گی احمر کیونکہ دادی ماں کی اس کرسی کو چھونا تو کجا اس کے بارے میں سوچنے کی بھی کسی کو اجازت نہیں ہے۔ تم خواہ مخواہ خود کو تھکا رہے ہو۔ میں تو چلی بھیّا، خدا حافظ، شب بخیر"

انجمن اٹھیں تو احمر نے انھیں پھر بٹھایا۔

"لیکن عید آ رہی ہے بھابی"

"تو آنے دو بھیّا۔ عید تو ہمیشہ ہی آتی ہے اس بار بھی جھم جھم آئے۔ کس کی مجال ہے جو عید کو آنے سے روک لے"

"مگر اس عید پر فارن سے میرا خاص الخاص دوست علی بھی آ رہا ہے بھابی"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے بھیّا یک پنتھ دو کاج والی ـــ"

"مگر آپ نہیں جانتیں کہ وہ نہایت فیشن ایبل اور ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھتا ہے بھابی"

"تو رکھا کرے بھائی۔ ہمارا گھرانہ کون سا ایسا پرانا دقیانوسی ہے جو ہم ناحق سوچ سوچ کر ہلکان ہوں"

"اُوّہ، آپ غور تو فرمائیں کہ صورتِ حال کتنی نازک ہے۔ داخلی دروازے کے عین مقابل بڑے ہال کے سرے پر دادی ماں کی وہ کرسی رکھی ہوئی ہے۔ ہے کہ نہیں ۔؟"

"ہاں ہے ...... تو۔؟"

"تو جب علی آئے گا اور تمام کوٹھی کے انتہائی جگمگاتے ہوئے ماحول میں اس کہنہ خستہ حال کرسی کو دیکھے گا تو کیا یہ نہیں سوچے گا بھابی جان کہ ہمیں صرف اپنی ہی فکر ہے جو بہتر سے بہتر سامان اپنے لیے رکھتے ہیں مگر دادی ماں کی کسی کو کوئی فکر نہیں تبھی تو نہایت گھسی پٹی وہ آؤٹ آف ڈیٹ کرسی ان کے استعمال میں موجود ہے۔"

یک لحظہ سوچ کر انجمن بھابی نے جتلایا "میاں سب جانتے بوجھتے جانتے ہیں کہ وہ کرسی دادی ماں کے والد ماجد کی ہے جسے دادی ماں اپنی جان سے عزیز رکھتی ہیں جس کی صفائی اور جھاڑ پونچھ اماں ہر روز خود اپنے ہاتھوں بجا لاتی ہیں کیونکہ کسی نوکر کو یہ اجازت نہیں کہ اس کرسی کو چھوئے تو پھر کیسے کوئی اس کرسی پر نگاہِ غلط بھی ڈال سکتا ہے احمر۔؟"

"سچ تو یہ ہے بھابی کہ میرے ایک جھٹکے کی بھی متحمل نہیں وہ کرسی۔ میں چاہوں تو منٹوں میں اسے ملبہ بنا سکتا ہوں لیکن......"

"خبردار...... خبردار احمر جو پھر کبھی ایسی بات کہی تو نے تو...... مذاق کا یہ مطلب نہیں شہزادے کہ تم حد سے آگے بڑھ جاؤ ـــ دادی ماں کا احترام تو ہر حالت میں برقرار رکھنا ہے ہر کسی کو۔ یہ مت بھولنا کبھی......" بھابی جلدی سے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

"ہمت...... بھسنڈی ہیں سب کے سب۔ کوئی ہمت والا نہیں۔ ہاں یہاں......"

احمر نے سوچا اور ناچار رضائی چہرے پر کھینچ لی۔

اسی رات طعام کا سارا کام ختم کر کے باورچی خانہ اپنی نگرانی میں بند کروا کے جب انجمن اپنی خواب گاہ میں پہنچیں تو دانش کو بنا بے حد منتظر پایا۔

"بھئی گھر کی بڑی بہو ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم اتنی اتنی دیر تک مجھے انتظار کرواتی رہو۔" دانش نے شکایتی نظروں سے اپنی چہیتی بیوی کو دیکھا۔

"آتو گئی ہوں نا۔ کیا کروں سبھی کچھ دیکھنا ہوتا ہے ہر طرف۔ پھر رنگ روغن کی وجہ سے بھی کام بڑھ گیا آج۔"

"خیر خیر آؤ......" اپنے نرم گرم آرام دہ بستر میں گھس کر انتہائی دل خوش کن باتیں کرتے کرتے اچانک انجمن اپنے شوہر سے بولیں۔

"سب تو ہو گیا جی لیکن ایک کام باقی رہ گیا ہے"

"اچھا۔ کون سا کام باقی رہ گیا ہے بھئی۔؟ بتاؤ تو ہم منٹوں میں پورا کروادیں اُسے۔ آخر تمہارے شوہر نامدار جو ٹھہرے اور ایک نامی گرامی چیف جسٹس کی اولاد بھی۔ دانش فخریہ مسکرائے۔

"سچ تو یہ ہے دانش کہ سچ مچ وہ کرسی ذرا میل نہیں کھاتی اپنی اس عالیشان کوٹھی سے" انجمن نے تاسف سے کہا۔

"کون سی کرسی۔؟ دادی ماں کی۔؟"

"ہاں جس کی چولیں تک ہل گئی ہیں پھر بھی دادی ماں اسے بدلنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں"

"اس سے دادی ماں کی جذباتی وابستگی ہے انجمن۔ سمجھا کرو۔ اس کی بابت سوچنا بے کار ہے کیونکہ وہ کرسی ہمارے تمہارے تو کیا خود اماں ابا کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے اس لیے بھول جاؤ اس کرسی کو۔ کوئی اور فرمائش کرو۔ سوائے اس کرسی کے تمہاری ہر ہر فرمائش سر آنکھوں پر جانِ من کہو تو چندن ہار لادوں۔ جڑاؤ گلوبند بنوادوں۔ عید کے لیے تمہیں عمدہ سے عمدہ تحفہ دے سکتا ہوں جانِ من فرمائش کر کے تو دیکھو ذرا۔۔۔۔۔"

مگر انجمن نے بجائے ایسی کوئی فرمائش کے قیمتی رضائی سے اپنا چہرہ ڈھکتے ہوئے سوچا۔ "اونہہ۔۔۔۔۔ پھسڈی ہیں سب کے سب ۔۔۔۔۔ کوئی ہمت والا نہیں رہتا یہاں۔۔۔۔۔ اور غنودہ آواز میں بولیں "نیند بہت آرہی ہے اب آپ بھی سو جایئے کل کریں گے بقیہ بات چیت ۔۔۔"

دانش نے ان کے اندازِ تغافل کو سمجھتے ہوئے اسی میں عافیت جانی کہ خود بھی رضائی چہرے پر کھینچ لیں، اور سکون کی آغوش میں پہنچ جائیں۔ کرسی کی بابت تلخ کلامی سے کچھ حاصل نہیں تھا لہٰذا وہ بھی کروٹ بدل کر سو گئے۔ اور اگلی صبح ناشتے سے فارغ ہو کر جب سب اپنے اپنے کاموں پر دفتر اور اسکول کالج چلے گئے تو مشین کا ہینڈل گھماتے گھماتے ہاتھ روک کر انجمن دبے دبے انداز میں اپنی ساس سے مخاطب ہوئیں۔

"اماں۔۔۔۔۔۔"

پکوڑوں کی کتر بیونت روک کر ان کی خوش دامن نے انھیں پیار سے دیکھا۔" کیا بات ہے دلہن کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

"جی ہاں امّاں ـــــ"

"کہنے کی کیا ضرورت ہے بیٹی، عید کی شاپنگ کے لیے جانا چاہتی ہو تو کسی فرصت کے وقت تہنیت اور سطوت کو ساتھ لے کر چلی جانا یا اگر کوئی زیور بنوانا چاہتی ہو تو بے شک فون کر کے اپنے سنار کو بلوا لینا۔ تمھیں اس گھر میں کسی طرح کی کوئی کمی یا تکلیف ہو یہ میں برداشت نہیں کر سکتی دلہن......؟"

"آپ تو جانتی ہیں امّاں کہ لوگ موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں؟"

"کیسے موقعے بیٹی؟"

"یہی کچھ نہ کچھ انٹ شنٹ کہنے کے امّاں؟"

"لیکن ہم نے کچھ بھی ایسا نہیں کیا ہے کہ لوگ ہماری بابت انٹ شنٹ بکواس کر سکیں تب؟"

"آپ درست فرمارہی ہیں امّاں، مگر"

"اُفّوہ؟" الجھ کر بیگم صدیق ملک بولیں۔" جو کہنا ہے کہہ بھی چکو دلہن۔ اب تم اتنی نئی نویلی دلہن نہیں ہو کر ساس سے مغلوب رہو۔ فوراً اصلی بات کی طرف آ جاؤ؟"

"وہ دادی ماں کی کرسی امّاں؟"

"کیا ہوا امّاں جان کی کرسی کو؟ ہر روز کی طرح آج کی صبح بھی میں نے اپنے ہاتھ سے صاف کر کے امّاں جان کی خدمت میں پیش کی ہے؟"

"جی امّاں لیکن وہ کرسی حد سے زیادہ پرانی اور آوٹ آف ڈیٹ ہو گئی ہے؟"

"تو کیا ہوا۔ وہ ان کے والدِ محترم کی یادگار ہے بیٹی اور یادگاروں کا نیا نویلا ہونا ضروری تو نہیں۔ چند روز قبل ہی امّاں جان نے کارپینٹر بلوا کر اس کی چولیں بھی مضبوط کروائی ہیں۔"

"پھر بھی لوگ کیا یہ نہیں سوچتے ہوں گے امّاں کہ گھر بھر کے تمام لوگ تو بہترین اعلیٰ قسم کے فرنیچر اپنے تصرف میں رکھتے ہیں صرف دادی ماں کی کرسی کی بابت ہی کوئی کچھ نہیں سوچتا۔ کیا یہ سوچ ہم پر ایک طرح کا الزام نہیں ہے امّاں......؟"

"سوچتے ہیں لوگ تو سوچنے دو انھیں۔ جھک مارتا ہے کوئی تو اس کے ساتھ ہمارا بھی جھک مارنا کوئی ضروری نہیں ہے دلہن۔ اس کرسی کی بابت کچھ بھی سوچنا ہماری ہمتوں اور سوچوں سے بہت پرے ہے چلو کام کرو اپنا۔ اس کرسی کا خیال یکلخت اپنے دل سے نکال دو۔"
بنھوں نے پھر کترپیونت کا سلسلہ جاری کر دیا تو ناچار انجمن بھی سلائی میں منہمک ہو گئیں۔ "میاں احمر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اپنی سی ہر کوشش کر لی میں نے تو......" کپڑے سیتے سیتے انجمن یہی کچھ سوچتی رہی اور اسی رات اپنا بڑا سا گنگا جمنی پاندان بند کر کے اور کلی سے اپنا منہ صاف کر کے اپنے بہترین بستر پر لیٹتے ہوئے بیگم صدیق ملک نے اپنے شوہر چیف جسٹس صدیق ملک سے کہا۔
"بفضل خدا تمام گھر کی صفائی ستھرائی ہو گئی۔ اب بے شک ماہِ صیام تشریف لائیں اور رہیں اپنی رحمتوں اور برکتوں سے مزید نوازیں صاحب لیکن......" چیف جسٹس صدیق ملک نے اپنی بیگم کو دیکھا۔ "کیا کوئی کام ادھورا رہ گیا بیگم یا حسب منشا نہ ہو سکا۔؟"
"سب کچھ حسب منشا اور مکمل ہوا ہے لیکن کیا آپ کو محسوس نہیں ہوتا کہ اماں جان کی کرسی اب حد سے زیادہ پرانی ہو گئی ہے اور آپ کی کوٹھی میں بالکل نہیں جچتی۔"
"نہ جچے نہ جچے وہ اماں جان کی کرسی ہے بیگم او۔ آپ تو جانتی ہی ہیں کہ اس پر ہمارا کوئی اختیار نہیں ہے۔ ہم خود کئی بار امی جان سے گذارش کر چکے ہیں کہ اب وہ اپنی کرسی بدل دیں اپنی پسند اور آرام کے لحاظ سے کوئی نئی کرسی خرید لیں لیکن اماں جان راضی نہیں ہیں وہ اپنی پرانی کرسی کو ہی کوٹھی کے تمام بیش قیمت سامان سے زیادہ اہم مانتی ہیں جس کی وجہ بھی آپ جانتی ہیں لہٰذا اس کرسی کے علاوہ کوئی اور شکایت ہو تو بتلایئے تاکہ فوراً بلا تاخیر اس کا سدِّباب کیا جا سکے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ہم آپ کا کوئی حکم کوئی خواہش کبھی نہیں ٹالتے۔"
شوہر کے لہجے کے مخفی تحکّم کو محسوس کر کے بیگم صدیق ملک نے فوراً گفتگو کا رخ بدل دیا دوران کی دل آرا باتیں سنتے سنتے چیف جسٹس صاحب پرسکون نیند کے حوالے ہو گئے تو بیگم صدیق ملک نے خود ہی دولائی کی نرم تہہ اپنے اوپر جمائی اور دل ہی دل میں سوچا۔ "تو یہ ۔ پھسڈی ہیں سب کے سب۔ کوئی ہمت والا نہیں رہتا یہاں۔ دیکھتے دیکھتے پھر

ماہ صیام کی رونقیں شروع ہو گئیں ۔ روزے، سحری، افطار ۔ انواع و اقسام کے بہترین پکوان نمازیں، تلاوتیں اور خیر خیرات ۔ مسجد میں نامِ خدا کے حصے بھجوانا ۔ غرض کہ عبادتوں اور اہتمام میں رمضان المبارک کا مہینہ روحانی عظمتوں کے احساس و اعتراف اور جسمانی پاکیزگیوں کے ساتھ ساتھ جیسے پلک جھپکتے گذر گیا تب عید اپنے جلو میں نئی مسرتیں لے کر آئی ۔ چوڑیاں مہندی، ملبوسات، زیورات، تحائف، شیر خرمہ اور عید کی شیر و شکر ملاقاتیں، نوازشیں عنایات...... خدا خدا کر کے لگاتار تین دن کی مبارک سلامت کے بعد عید کے دل خوش کن ہنگامے ختم ہوئے تو ساتھ کے ساتھ پھوپی اماں کی اکلوتی نورِ چشم فضیلت کے بیاہ کے رسومات جو پہلے سے طے تھیں شروع ہو گئیں ۔ بمعہ دادی اماں کے چیف جسٹس صدیق ملک کا پورا گھرانا اس شادی میں شرکت کے لیے پھوپی اماں کے گھر منتقل ہوا۔ نوکر چاکر تک بیاہ کی سرگرمیوں میں مقدور بھر ہاتھ بٹانے کے لیے پھوپی اماں کی کوٹھی پہنچ گئے ۔ صرف دو چوکیدار چیف جسٹس صاحب کی کوٹھی کی نگرانی کے لیے چھوڑ دیے گئے اور بس ۔

بی بی فضیلت چونکہ خاندان کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں اور ان کے والدِ محترم جناب امتیاز حسین صاحب اپنی خاندانی امارت اور سرکاری عہدے میں کسی طرح بھی چیف جسٹس صاحب سے کم نہیں تھے بلکہ حکومتِ وقت کے مدار المہام کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے لہٰذا بی بی فضیلت کی شادی خانہ آبادی کی تیاریاں اور طمطراق قابلِ دید تھا۔ پھوپی اماں نے اپنے تمام سسرالیوں اور مانگنے والوں کو فرداً فرداً جی کھول کر نوازا تھا۔ یہاں تک کہ دونوں طرف کے ملازمین کو بھی حسبِ مقام معقول بخششوں سے سرفراز کیا گیا تھا لہٰذا سب کی زبانوں پر پھوپی اماں کی فراخدلی غریب پروری اور اس شادی کے چرچے تھے اور سبھی جی جان سے ہر طرح کی تیاریوں میں مشغول و منہمک بہ دل و جان مصروف تھے ۔ کوئی ناخوش و ناراض نہیں تھا ۔ ہر ہر طرف مسرت و شادمانی کا راج ہی راج تھا۔ شادی کی تمام رسومات انتہائی تفصیل سے ادا ہو رہی تھیں اور چھوٹے بڑے سب نہال بحال فاخر تھے کہ خدا خدا کر کے یہ مسعود مرحلہ بھی بخیر و خوبی پایۂ تکمیل کو

پہنچا اور تمام ضروری فرائض اور خدمت گذاریوں کی ادائیگی کے بعد چیف جسٹس صاحب کا
خاندان اپنی کوٹھی کو واپس ہوا تو کئی دنوں کے تھکے ہارے تمام لوگ ایسا سدھ بدھ بھول کر
سوئے کہ نہ کسی کو اپنا ہوش رہا نہ کسی اور کی فکر۔ سب گہری بے حد گہری نہ ٹوٹنے والی نیند میں
مست تھے کہ اسی عالم میں جب جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگائے گئے تو جاگتے ہی سب کے سب اپنی
جگہ بت بن گئے۔ جو ناقابلِ یقین منظر ان کی نظروں کے سامنے تھا وہ ایسا ہی ناگاہ جگر خراش
اور روح فرسا تھا کہ انتہائی شور و غوغا اور چیخ و پکار کے باوجود انھیں اپنے حواسوں
میں نہ لوٹا سکا۔ سب کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔

بہ ہزار دقت پڑوسیوں نے کھینچ کھانچ کر تمام افراد کو کوٹھی سے باہر نکالا اور ممکنہ
عجلت سے فائر بریگیڈ طلب کیا گیا مگر جب تک فائر بریگیڈ کا عملہ جائے واردات پر پہنچا
لاکھوں کروڑوں کی محنت جمیلہ و مساعی سے آراستہ و پیراستہ وہ بے مثال و بے نظیر کوٹھی
راکھ کا ڈھیر بن گئی۔

مکینوں کے دل و دماغ اتنے افتادہ اور شل تھے کہ انھیں تو رونے کا بھی یارا
نہ رہا تھا لیکن ذمہ داروں کی خصوصی جانچ اور تحقیق کا لب لباب یہ تھا کہ آگ شارٹ
سرکٹ کا نتیجہ تھی لیکن جو بات قابلِ حیرت تھی وہ یہ کہ بیشتر خاکستر اور کمتر ادھ جلی کوٹھی کے
ملبے میں اگر کوئی چیز بالکل ثابت و سالم تھی تو صرف دادی ماں کی خستہ و بے حال بہت
پرانی میلی کچیلی کرسی جس پر برسوں سے صبح شام بیٹھ کر دادی ماں بلا ناغہ دکھ بیماری
کی حالت میں بھی باالالتزام تسبیح پڑھا کرتی تھیں۔

بائی فوکل

جب وہ تعلیم ختم کرکے یونیورسٹی سے نکلا تو بالکل نوجوان اور حوصلہ مند تھا۔ اس کا دل آرزوؤں اور دماغ حوصلہ افزائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ حصولِ علم کے بعد اس کی سب سے پہلی اور زبردست خواہش تھی ایک ہنس مکھ باذوق تندرست لڑکی کی رفاقت جو ہونہاری کے سبب اسے بہت جلد مل گئی۔ جب اس لڑکی کو دلہن بناکر آفاق نے نئی زندگی شروع کی تو ساری کائنات آفاق کو شہد ہی شہد محسوس ہوئی۔ بس ایک جرعۂ شیریں جو ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا جس کا سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک آفاق سیر ہو گیا تب آفاق کو آرزو ہوئی کہ اپنی زندگی کی طرح اپنے گھر کو بھی تمام جدید سہولتوں اور قیمتی اشیا سے بھر ڈالے۔ اس کی یہ آرزو بھی بتدریج پوری ہوگئی۔

پھر تمنا ہوئی کہ عہدِ حاضر کے ممکن الحصول نوادرات بھی ضرور جمع کیے چنانچہ ایک معقول ذخیرہ اپنے پسندیدہ نوادرات کا بھی آفاق نے کافی عرصے میں جمع کرلیا۔

تب شوق، عمر اور تجربے کے ساتھ ساتھ شہرت یافتہ آرٹ گیلریوں میں گشت لگائی اور نقادانِ آرٹ کے مشوروں اور خود اپنے شوق کے سہارے چند در چند شہرۂ آفاق پینٹنگس اکٹھا کیں۔

مشہورِ زمانہ عجائب گھروں کے چکر لگائے اور اپنی حد و حیثیت کے لحاظ سے کم یاب عجائبات بھی اپنی کوٹھی کے ایک مخصوص حصّے کی زینت بنائے۔

کوٹھی کو اندرونی طور پر سنوارنے کے بعد آفاق نے بیرونی طور پر بھی نظر نواز اور دیدہ زیب
چمن بندیوں کے ذریعہ کوٹھی کی مزید رونق بڑھائی۔

اب محدود پیمانے پر ہی سہی کوئی ایسی آسائش نہ تھی جو آفاق کے پاس نہیں تھی۔
عالیشان کوٹھی ست منذرکار، عمدہ و بہترین فرنیچر۔ عہدِ نو کی تمام ماڈرن ضروریاتِ زندگی، اعلیٰ
پائے کی پینٹنگس، نوادرات، عجائبات۔ اندرونی صحن میں دھوپ اور چھاؤں کی مناسبت سے
پھولوں اور پھلوں کے درخت، فرحت بخش سبزوں کے قطعات کے درمیان سنگِ سفید
کے سیمیں پھوار اگلتے ہوئے طرحدار فوارے اور اندرونِ خانہ سنگِ سیاہ کے اہمیت
کے حامل مناسب جگہوں پر ایستادہ مجسمے۔

جب وہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوا تھا تو اس کے پاس صرف موروثی دولت
اور شہرت تھی مگر پھر گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی موروثی دولت و شہرت
میں خود اپنی کمائی ہوئی دولت و شہرت اور محنت ملا کے اپنی قابلیت، صلاحیت اور
ذوق کے بل بوتے کافی عرصے میں قابلِ لحاظ جدوجہد اور استقلال سے آفاق نے مختصر
پیمانے پر ہی سہی لیکن پنی تمام خواہشات اور آرزوؤں کی تکمیل کر ڈالی۔ اب کچھ بھی ایسا
نہ تھا جو اس کی دانست میں قابلِ حصول رہ گیا ہو۔ اس کی بیوی اس سے خوش تھی اور تمام
بچے ہر ہر طرح آسودہ حال اپنی پڑھائی، اپنے مشاغل، اپنے دوست احباب کے ساتھ
خوش و خرم اپنے شفیق والدین کے زیرِ سایہ خوش خرامی اور خوش طبعی سے جانبِ مستقبل
رواں دواں تھے۔ اس اعتبار سے موروثی دولت کے علاوہ اب بہت کچھ صرف اپنا
اپنی محنت کے بل پر حاصل کیا ہوا آفاق کا حصہ تھا جس نے اسے دنیا کا بے فکر ترین اور
فاخرانسان بنا دیا تھا لیکن ان تمام بیش قیمت چیزوں اور خود اپنی مکمل طور پر خوشحال
زندگی کی ناگزیر دیکھ ریکھ کے باوجود وقت گذاری کے لیے آفاق کو مزید کچھ چاہیے تھا۔
کیا۔؟

تب بہت سوچ سوچ کر آفاق نے دنیا کے تمام بہترین ادیبوں کی انمول کتابیں
جمع کیں جن کے مطالعے نے آفاق کو ایک نیا ذہنی افق عطا کیا اب تک جس سطح پر وہ اپنی

زندگی جی رہا تھا اب دفعتاً وہ سطح آفاق کو بے کار اور لاحاصل محسوس ہوئی۔ اپنے تمام شوقوں کے حصول کے لیے اس نے اپنی جو عمرِ عزیز اور جوانی خرچ کی تھی۔ جن کی دستیابی کے لیے حد سے بڑھ کر جرأتیں اور ہمتیں کی تھیں، سو سو آفتیں جھیلی تھیں، وہ سب کچھ اب آفاق کو یکایک بے حد ارزاں اور غیر ضروری معلوم ہونے لگا

تو کیا اس نے اپنی گراں مایہ زندگی کا وہ تمام عرصہ محض ضائع کر دیا تھا۔؟

آفاق بے حد اداس و غمگین ہو گیا لیکن اس نے اپنے دل کا حال کسی سے نہ کہا۔ اپنی یہ کیفیت تمام دوستوں سے چھپا گیا۔ مسلسل یہی سوچتا رہا کہ اتنا سب کچھ پا لینے کے بعد بھی وہ کیوں خود کو خالی خالی محسوس کر رہا ہے۔ کیوں اپنی تمام کوششوں سے سنواری سجائی ہوئی بلند سطح زندگی سے مطمئن نہیں۔؟ کوئی کمی ایسی رہ گئی ہے جو فہم کی گرفت میں نہیں آتی؟ کیا ہے وہ جو اس کے اب تک کے برباد شدہ وجود کو ایک مقام، ایک ٹھکانہ، ایک حقیقت عطا کر سکے۔

کیا۔؟

اس کے بچے اب وہی کر رہے تھے جو خود آفاق نے اپنی نوجوانی میں کیا۔ اپنے حالیہ تجربے کی تلخی کے تحت آفاق نے اپنے بچوں سے بار بار کہنا چاہا۔ سب بے کار ہے۔ یہ سب جو تم خوشی خوشی کر رہے ہو بالکل بے کار ہے بچو۔ پہلے خود کو جانو کہ خود کو پہچانے خود سے گذرے بغیر دنیا سے گذرنا نہ صرف فضول بلکہ ناممکن۔ پھر وہ سوچتا اس کا اس طرح کہنا مناسب نہیں ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ تمام بچے اپنی اپنی منتخب راہ پر چلتے ہوئے خود تجربوں کے دشت سے گذریں اور خود جانیں کہ زندگی صرف گیت نہیں بلکہ گیت کو وجود میں لانے سے شایانِ شان الفاظ اور معنی بخشنے، نغمگی عطا کرنے کی بے پایاں جدوجہد ہے۔ زندگی صرف رقص و سرود نہیں بلکہ صبر و تحمل اور ذہانت سے رقص کی نزاکتیں سمجھنے اور ان نزاکتوں کو دوام عطا کرنے کی کڑی ریاضت ہے۔ زندگی محض ایک کتاب نہیں بلکہ کتاب کی معنویت کی تہہ داری کا تحقیقی علم ہے۔ زندگی ریڈیو، ٹیلی ویژن، ڈیک، وی سی آر، ریفریجریٹر، کوٹھی کار، سونا موتی جواہرات ہی نہیں بلکہ وہ ریکارڈ ہے جو صرف اپنی ہی ذات میں مجتمع ہوا میسر نہیں

لگتا جب تک کہ اس ریکارڈ میں تمام دنیا کی آواز شامل نہ ہو جائے۔

یہ زندگی کا عجیب مرحلہ تھا۔ بڑا سنگین مقام جہاں برسوں کی عرق ریزی سے حاصل اپنا تمام مال ومتاع و سرمایہ اپنا رجحان۔ شوق ذوق، اپنی کاوش آفاق کو ایک دم لاحاصل معلوم ہونے لگی حتیٰ کہ اپنی عزیز ترین بیوی بھی ادھوری نامکمل جو خود آنکھیں بچھائے حیرت و سراسیمگی سے آفاق کے اس نئے انداز کو دیکھنے لگی تھی جس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ زندگی کی دل خوش کن کھنک چانک ہی کہاں گم ہو گئی۔ ؟ جس انداز سے وہ اپنے پیارے شوہر کے بارے میں سوچ سوچ کر ہراساں تھی آفاق اس انداز کے بالکل الٹا انداز میں اپنی بیوی کے لیے خود کو قصور وار ٹھہرا رہا اور افسوس مند ہو رہا تھا۔ بے شک اس نے اپنی بیوی کو سب کچھ کہہ دیا تھا۔ اپنی تمام الفت ومحبت اور زندگی کا بلند ترین مقام اہم سماجی مرتبہ معروف وممتاز حیثیت۔ لیکن کاش وہ اپنی بیوی کو ان چیزوں کے ساتھ وہ فہم بھی دے سکتا جو زندگی کے اس مقام پر اسے احساس دلا سکتی کہ دنیا عبث ہے۔ دنیا بالکل عبث۔ فقط ایک جال، ایک جیل، ایک قید......!!!

بلاشبہ آفاق کو اپنی بیوی بے لوث کی بہترین ساتھی محسوس ہوتی۔ پکاسو کا آرٹ، بیزونی کا شاہکار لیکن وہ آفاق کو کبھی اس کتاب کی طرح نظر نہ آئی جو خود میں علم و دانش کے نئے نئے موڑ رکھتی ہو۔ جو قدر کو تو کچھ زاویے اور جلا بخش سکتی ہو یقیناً اس کے بچے ایک نہ ایک دن اپنا اپنا مستقبل پا لیں گے۔ لیکن اس کی بیوی جو اپنی عمر کا بہترین حصہ خرچ کر چکی ہے شاید اب کچھ نہیں پا سکتی۔ احساس آسائش اور احساس طمانیت کے علاوہ جن کی بنیادیں بے حد عارضی و کمزور ہیں کیونکہ نصاب کی چند کتابیں پڑھ کر اور زندگی کے چند عملی اوراق الٹ کر ذات انسانیت کے اس عمق تک ہرگز نہیں پہنچ سکتی جو اسے یکتا و رگانہ بنا سکے۔ اس کی بیوی کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنے شوہر آفاق کو خوب جانتی ہے لیکن آفاق کو یہ ملال کہ نہ وہ آفاق کو جانتی ہے نہ ہی خود کو کیونکہ اسے معلوم ہی نہیں کہ اس عظیم الشان دنیا میں بیتھوون باخ، موتزارٹ اور واگنر ہیں۔ لیونارڈو ڈاونچی، مائکل اینجلو، وین گاگ۔ سیزانے، مارشل اور پکاسو ہیں۔ بیزونی ہے۔ اسی دنیا میں سقراط بقراط، افلاطون اور ارسطو تھے، حضرت محمدؐ اور

یسوع مسیح تھے۔ گوتم بدھ تلسی داس ورکبیر اور گرونانک تھے۔

والمیکی اور کالی داس تھے۔ روسو، والٹر، ابن رشد، اسپیقورس، کارل مارکس اور لینن تھے۔

گوئٹے، نطشے، برگساں اور برٹینڈرسل تھے۔ آندرے ژید، اناطول فرانس، بالزاک، موپاساں اور فلابیر تھے۔

گورکی، ٹالسٹائی، چیخوف، شیکسپئر، ورڈسورتھ، ملٹن، شیلی، بائرن اور ٹینی سن تھے۔

او ہنری، سمرسٹ ماہیر، آسکر وائلڈ اور برنارڈ شا تھے۔

خلیل جبران، امیر خسرو، ٹیگور، نذرالاسلام، پرل بک اور مصطفیٰ لطفی المنفلوطی تھے۔

نپولین، بسمارک، اتاترک تھے۔ قلوپطرہ، نائٹ انگیل، چاند بی بی، سلطانہ اور مہارانی جھانسی تھیں۔

حبہ خاتون، ماہ لقا بائی چندا، امرتا شیر گل، میرابائی اور زیب النساء تھیں۔

سکندر، اشوک، اکبر، شاہ جہاں اور ٹیپو سلطان تھے۔

جارج ایف کینیڈی، پنڈت جواہر لال نہرو اور اندرا گاندھی تھیں۔ امن کے پیامبر گوربا چیف ہیں اور خدا جانے کون کون .....

تہذیب، فلسفہ، سائنس، موسیقی، ادب، آرٹ، کلچر، طبعیات، تصوف، تاریخ، مذہب ثقافت، طب، اور سیاست ہے۔

وہ بے چاری تو بس اتنا جانتی تھی کہ وسیع آسمان پر خدائے ذوالجلال ہے اور وسیع زمین پر صرف اس کا شوہر۔ آفاق ہی منتہائے فکر و نظر۔ اسی لیے آفاق کے کرب سے بے گانہ بے نیاز، بے خبر اپنی کم مائیگی کے المیے پر آنسو بہانے کی بجائے اپنی مطمئن آنکھوں سے بیٹے بچوں، گھر گرہستی، اپنی حکمرانی کو فخر و غرور اور بے تحاشہ و بے پناہ مسرت سے دیکھ دیکھ کر سوچتی تھی۔ کیا ہے اس دنیا میں ایسا جو میرے پاس نہیں ہے۔

حتیٰ کہ وہ گھبراہٹ بھی جو پچھلے کچھ عرصے سے اس کی یقینی مسرت کا غیر یقینی حصہ بن گئی تھی، اپنے شوہر کے زور پر اسے قابلِ تسخیر معلوم ہوتی تھی لیکن وہ کتنا بزدل تھا جو اپنی بیوی کو

یہ نہیں بتاتا تھا کہ اتنی ساری بیش قیمت چیزیں پاکر بھی وہ تہی دست و تہی داماں رہ گئی ہے کیونکہ آفاق خود نہیں جانتا تھا کہ اس کی تمام ترین جد و جہد اور حصول یابیوں میں وہ کون سی کسر رہ گئی ہے جو خود اسے مکمل ہونے سے روکے ہوئے ہے، جو اس کے مطمع نظر مقصدِ حیات کی تمام تر قابلِ ذکر و قابلِ فخر کامیابیوں، اس کی تمام فراخ دامنی اور ذہنی وسعت و سطوت کے باوجود اسے تنگ دامانی کی جان لیوا جانکاہ کیفیت میں مبتلا بے بس و بے دست و پا کیے ہوئے ہے۔ مختلف زاویہ ہائے فکر رکھنے والی انمول لازوال کتابیں پڑھ پڑھ کر ان کے عطا کردہ "بائی فوکل" سے دنیا کو دیکھ دیکھ کر وہ بس یہی سوچے جا رہا تھا کہ کون یہاں ناکام ہے۔؟ کون کامیاب؟ اس ناکامی اور کامیابی کے کیا اسباب۔؟ مگر......

کاش وہ کسی غریب کے ذہن و دل میں اتر کر وہاں سے ایک نظر اس کی ٹوٹی پھوٹی تاراج دنیا کو دیکھ لیتا تو شاید پھر اسے کسی "بائی فوکل" کی ضرورت ہی نہ رہ جاتی تب وہ یقیناً مکمل مطمئن اور ناقابلِ تسخیر ہو جاتا مگر ساری دنیا دیکھ کر ہر ہر چیز پاکر بھی آفاق نے کسی غریب کے ذہن و دل کو کہاں دیکھا۔ اس کی محرومیوں کو کہاں جانا، اس کی دردمندی کی توفیق خود میں کہاں پیدا کی تھی......

چند معیاری کتابیں

ناول، افسانے، ڈرامے اور انشائیے

اپنی اپنی زنجیر	ستیہ پال آنند	50/=
پریم چند کے سو افسانے	مرتب : پریم گوپال متل	280/=
کہی ان کہی	اوم کرشن راحت	40/=
برف کے پھول	حسنی سرور	40/=
کستوری کنڈل بسے	ڈاکٹر نریش	40/=
کھلا	جوگیندر پال	80/=
انمول رتن	دین راج ٹوپجہ	35/=
عذرا	صالحہ عابد حسین	50/=
پاگل خانہ	حجاب امتیاز علی	60/=
کہتا ہوں سچ	شرف کمالی	50/=
پاکستان ایکسپریس	خشونت سنگھ	30/=
پلس مائی نس	آمنہ ابوالحسن	40/=
جاتی ہوئی رت	کشمیری لال ذاکر	25/=
میرا آنچل میلا ہے	" " "	30/=
بیری والا فقیر	" " "	25/=
کرماں والی	" " "	20/=
بے چین لمحوں کا تنہا سفر	وریندر پٹواری	40/=
دوسری کرن	" " "	35/=
آخری کرن	" " "	35/=

کتاب	مصنف	قیمت
اندھے رشتے (ڈرامے)	انل ٹھکر	40/-
دستاویز سعادت حسن منٹو ترتیب:	بلراج مینرا	45/-
اتفاق	ڈاکٹر نرلش	30/-
درد کا رشتہ	" "	35/-
ڈھلتا سورج	شیخ اسماعیل	30/-
اپنے مرکز کی طرف	اوم کرشن راحت	35/-
ساحل، سمندر اور سیپ	ہیرانند سوز	35/-
قدم قدم دوزخ	محمد بشیر مالیر کوٹلوی	35/-
کوکن کے افسانے (افسانوی انتخاب)	انجم عباسی	40/-
پت جھڑ کے مسافر	مصور سبزواری	30/-
سلمیٰ سے دل لگاکر	نیر واسطی	18/-
عداوت	بالادوبے	25/-
ویٹنگ روم	ایس۔ایم حیات	30/-
شمشیر و سناں اوّل	دلیش چتر کار	25/-
پنجرے کے پنچھی	مانک ٹالا	35/-
بادل چھٹ گئے	محمودہ بشیر	50/-
پرواز	رشید قاضی	40/-
حرف حرف داستان	عظیم اقبال	40/-
ایک ٹانگ کی گڑیا	کوثر سیمیں	20/-
خالی خانے (ڈرامے)	انل ٹھکر	20/-
بادل گرجیں جمنا پار	سدرشن شرما	18/-
چوری سے یاری تک	ڈاکٹر وزیر آغا	18/-